جلد ۷۶ ماہ ربیع الثانی ۱۳۷۵ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۵۵ء عدد ۶

مضامین

شذرات

اپنی صحیح خارجہ پالیسی کی بدولت ہندوستان نے چند برسوں کے اندر بیرونی دنیا میں اتنی اہمیت اور اعتماد و وقار حاصل کر لیا ہے کہ بڑی بڑی حکومتیں اس کی دوستی کی خواہشمند اور پیچیدہ بین الاقوامی معاملات میں اسکی امداد اور رہنمائی کی طلبگار رہتی ہیں، اور اس مقصد کے لیے مختلف حکومتوں کے نمائندے برابر آتے رہتے ہیں، چنانچہ گذشتہ مہینہ میں دو بڑی حکومتوں کے سربراہ اور حکمراں ہندوستان آئے، ایک کمیونسٹ دنیا کے لیڈر اور روس کے وزیر اعظم بلگانن اور ان کے رفیق خروشیف، دوسرے سعودی حکومت کے فرمانروا سلطان سعود بن عبد العزیز، اگرچہ سعودی حکومت کوئی بڑی طاقت نہیں ہے لیکن دنیائے اسلام کے مذہبی مرکز کی خدمت، پٹرول کی دولت اور مشرق وسطیٰ کی سیاست کی بنا پر اسکی بڑی اہمیت ہے، عرب حکومتوں میں مصر کے بعد سب سے بڑی اور بیرونی اثرات سے آزاد یہی حکومت ہے، اور عرب اور ہندوستان کے تعلقات نہایت قدیم ہیں، ظہور اسلام کے بہت پہلے سے ان دونوں میں تجارتی تعلقات قائم تھے، پھر اسلام کے بعد علمی، مذہبی، تہذیبی اور سیاسی مختلف قسم کے تعلقات پیدا ہو گئے، اور ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام سے پیشتر جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں میں عرب تاجروں کی آبادیاں قائم ہو گئی تھیں، مالابار کے موپلا انہی عربوں کی یادگار ہیں،

ہندوستان میں اگرچہ عربوں کی حکومت کل ڈیڑھ دو صدی رہی اور سندھ اور ملتان سے آگے نہیں بڑھی، مگر اس نے یہاں بڑے پائدار نقش چھوڑے جو اب تک باقی ہیں، اس کے بعد غزنویوں سے لیکر لودیوں تک ہندوستان میں جتنی حکومتیں قائم ہوئیں وہ سب عباسی خلافت کی مذہبی سیادت کو مانتی تھیں، اور عباسی خلفاء کے خطبہ پڑھتی تھیں، اور ان کے اکثر فرمانروا اپنے سکوں پر بھی ان کا نام نقش کرتے تھے، اس طرح

عرب و ہندوستان کے درمیان صدیوں سیاسی تعلق بھی رہا، اور جب خلافت کا منصب ترکوں کی جانب منتقل ہو گیا، اس وقت بھی ہندوستان کے مسلمانوں کا مذہبی تعلق بدستور عرب سے قائم رہا، اور وہ حرمین کی خدمت اپنے لیے باعثِ فخر و سعادت سمجھتے تھے، یہاں کے سلاطین و امراء کی جانب سے حرمین کے لیے بڑے بڑے اوقاف تھے، اور ان کے خدام کے لیے سالانہ نذرانے اور تحائف جاتے تھے، جس کا سلسلہ حیدرآباد، بھوپال اور ٹونک وغیرہ کی ریاستوں کے خاتمہ تک برابر قائم تھا، آج بھی ہندوستان میں چار کروڑ مسلمان آباد ہیں، ان کی اتنی بڑی تعداد پاکستان اور انڈونیشیا کے علاوہ کسی اسلامی ملک میں بھی نہیں ہے، ہر سال ہزاروں ہندوستانی حج و زیارت کے لیے جاتے ہیں، اس مذہبی تعلق کے علاوہ دونوں ملکوں کے درمیان تہذیبی رشتہ بھی بڑا قوی ہے، اسلام نے ہندوستان کے ہر شعبۂ زندگی میں بڑا گہرا اثر ڈالا ہے، کسی غیر اسلامی ملک میں اسکے اتنے اثرات نہیں ہیں جتنے ہندوستان میں ہیں، اور ہندوستانی تہذیب کا کوئی پہلو بھی اسکے اثر سے خالی نہیں ہے۔

خود عربوں کو ابتدا سے ہندوستان کے ساتھ بڑا لگاؤ رہا ہے، عرب مصنفین نے اپنی کتابوں میں ہندوستان کو اسلامی ملکوں کے پہلو بہ پہلو جگہ دی ہے، اور ہندوستان کی قدیم تاریخ، اس کے مذاہب، علوم و فنون، تہذیب و معاشرت وغیرہ کے حالات بھی لکھے ہیں، بلکہ بعض مصنفین نے اس پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں، اور یہ کتابیں ہندوستان کے اسلامی عہد کی فارسی تاریخوں سے زیادہ قدیم اور ہند قدیم کے حالات کا بڑا مستند ماخذ ہیں، اس حیثیت سے عربوں نے ہندوستان کی بہت بڑی علمی خدمت انجام دی ہے، اسلیے عرب و ہندوستان کے تعلقات کی جڑیں بڑی گہری ہیں۔

موجودہ بین الاقوامی حالات نے ان تعلقات کی اہمیت اور زیادہ بڑھا دی ہے، عرب اور ہندوستان دونوں پڑوسی ملک ہیں، ایک کے سیاسی حالات کا دوسرے پر اثر پڑنا ناگزیر ہے، عرب حکومتوں کا سلسلہ عراق سے لیکر شام و مصر تک چلا گیا ہے، اور یہ پورا علاقہ امریکن اور کمیونسٹ بلاک کی شاطرانہ چالوں کا آماجگاہ بنا ہوا ہے، عرب حکومتوں میں مصر کے بعد سب سے بڑی اور بیرونی اثرات سے آزاد سعودی حکومت ہے، اور بین الاقوامی سیاست میں ہندوستان کی ہم خیال ہے، ان اسباب کی بنا پر دونوں کے تعلقات کی تجدید ضروری تھی، یہ مسرت کا مقام ہے کہ اس ضرورت کو

محسوس کرکے دونوں حکومتوں نے ایک دوسرے کیجانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے، اور اس مبارک مقصد کیلئے خود سلطان نے ہندوستان آنے کی زحمت گوارا کی، اسلیے یقین ہے کہ اس سے دونوں کے تعلقات میں اور زیادہ استواری ہوگی، اور مشرق وسطیٰ کی سیاست پر اس کا بڑا اثر پڑیگا، سلطان سعود کی حیثیت محض ایک مسلمان حکمراں کی نہیں ہے بلکہ وہ خادم الحرمین بھی ہیں، اسلیے مسلمانوں کا ان سے اخوت کے علاوہ عقیدت کا بھی تعلق ہے، اس لیے ہم ان کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں، اور انکی آمد کو ہندوستانی مسلمانوں کی خوش بختی اور انکے لیے فال نیک سمجھتے ہیں،

دوسرے دونوں مہمان کمیونسٹ دنیا کے رہنما اور ایک بڑی حکومت کے وزیر اعظم ہیں، ہمارے نقطۂ نظر سے کمیونزم اور امپیریلزم دونوں کی بنیاد خالص مادیت اور خود غرضی پر ہے، اسلیے دونوں دنیا کے لیے فتنہ ہیں، مگر اس وقت امپیریلزم کی فتنہ انگیزی زیادہ بڑھ گئی ہے، اور بلگانن دنیا کے لیے امن و آزادی کا پیام لیکر آئے ہیں، اور روس اور ہندوستان کے اتحاد کا اثر دنیا کے امن و امان پر بہت گہرا پڑیگا، اسلیے ایک معزز مہمان اور امن کے پیامی کی حیثیت سے ہم ان دونوں کا بھی خیر مقدم کرتے ہیں، مگر انھوں نے دلی اور آگرہ کی تاریخی عمارتوں اور ان کے بانیوں کے بارہ میں جو خیالات ظاہر کیے ہیں وہ نہایت لغو اور مہمل ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انکو انکی تاریخ سے واقفیت نہیں ہے، پھر ہر چیز کو کمیونزم کے محدود پیمانہ سے ناپنا صحیح نہیں ہے، ورنہ انسانی عقل و دماغ کے سارے کارنامے اور انسانی ترقی کی پوری تاریخ پر پانی پھر جائیگا، خود کمیونزم کا یہ حال ہے کہ دنیا کا بڑا حصہ اسکو بدترین قسم کا استبدادی نظام سمجھتا ہے جس میں انسانی آزادی اتنی سلب ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ اور جذبات و خیالات کا بھی مالک نہیں رہجاتا اور جسمیں ادنیٰ اختلاف رائے کی سزا قتل اور پھانسی ہے جسپر روس کے واقعات شاہد ہیں، ایسی حالت میں اسکے معیار کی کیا قیمت ہوسکتی ہے، پھر انھوں نے جو بیانات دیے ہیں وہ تاریخی حیثیت سے بھی سراسر غلط ہیں، اور اس سے انھوں نے اپنی تہذیب و شائستگی اور دانشمندی کا کوئی اچھا نمونہ پیش نہیں کیا، مگر وہ اسمیں ایک حد تک معذور بھی ہیں، اسلیے کہ ابھی وہ اس منزل کے بالکل نووارد ہیں اور اسکے آداب و رسوم سے واقفیت حاصل کرنے میں انکو عرصہ لگے گا، مدراس کے گورنر سری پرکاش صاحب نے بھی اپنی دعوت میں جو انھوں نے ان لیڈروں کے اعزاز میں دی تھی بڑی خوبصورتی سے ان غلط خیالات کی تردید کی ہے،

مقالات

سُلوکِ سُلیمانی پر ایک اجمالی نظر

از جناب اشرف خانصاحب ایم، اے لکچرار عربی اسلامیہ کالج پشاور

(۴)

تلاوت قرآن

جس طرح ہر عمل میں جان اخلاق و احسان سے پڑتی ہے، اسی طرح قرآن کریم کے برکات و انوار بھی اسی وقت حاصل ہوتے ہیں، جب اخلاص و احسان کی کیفیت کیساتھ تلاوت کی جائے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے قرب و حضور کا دھیان اس طرح چھایا ہو کہ ان کا کلام ان ہی کو سنایا جارہا ہے، حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ

"قرآن شریف کی تلاوت اس سکون اور استحضار سے کیجائے (کہ) اللہ تعالیٰ سن رہے ہیں اور آپ ان کو سنا رہے ہیں"

ایک صاحب کو تحریر فرماتے ہیں :-

"قرآن پاک اس تصور سے پڑھیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری تلاوت کو سن رہے ہیں، پھر جب اللہ تعالیٰ اس کو سماعت فرما رہے ہیں، تو ہم کو کس ذوق و شوق سے پڑھنا چاہیے، اگر یہ تصور ہو کہ ہمارا محبوب ہماری فریاد کو پاس کھڑا اپنے کانوں سے سن رہا ہے تو اس فریاد کی لے کیسی پر لذت ہوگی،

اس سے بڑھ کر اور کیا میرے لیے انعام ہو — آپ خود سنتے ہیں اگر جو مرا پیغام ہے"

حب الٰہی وخشیت ربانی

سلوک عشق و محبت کا راستہ ہے۔ اس کی ہر منزل محبت کی شعلہ سامانیوں سے ہی طے ہوتی ہے، محبت کا جو بیج یوم الست میں بویا گیا تھا، سلوک کے مجاہدات سے اس کی آبیاری ہوتی ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کی محبت ہی وہ سرمایہ ہے جو سالک کے مردہ قلب میں جان ڈال دیتا ہے، آتش محبت ماسوا کے تصورات کو مٹا کر "جلوۂ جانانہ" سے ہم کنار کرتی ہے، اور داغ محبت وہ چراغ طور ہے، جس کی تجلیاں عارف کے دل کو تاباں و درخشاں کرتی ہیں، اگر محبت نہ ہو تو دل اور پتھر میں کوئی فرق نہیں، اس لیے حضرت رحمۃ اللہ محبت وخشیت الٰہی کی بڑی تلقین فرماتے تھے، ایک خط میں مولانا مسعود عالم ندویؒ کو لکھتے ہیں:

"آپ کے اس دوسرے خط نے مجھے بہت با امید بنا دیا ہے۔ میں یہ سمجھ چکا تھا کہ وہابیوں کی خشکی آپ پر ایسی غالب آگئی ہے کہ عشق و محبت کی گنجایش آپ کے دل میں نہیں رہی ہے، الحمدللہ کہ میری یہ غلطی آپ کی نسبت آج جاتی رہی، میرا ایک پرانا شعر ہے:

اظہار کر کے عشق و محبت کے راز کو — پھر سے بنا دیا مجھے امید وار آج"

(مکاتیب ص ۱۴۹)

ایک مرتبہ فرمایا:۔

"محبت الٰہی اور خشیت تو دین کی بنیادی چیزیں ہیں، محبت اللہ تبارک وتعالیٰ کے احسانات میں غور و فکر کرنے سے پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ڈر کسی جابر و قاہر سے خوف کھانے کی طرح نہیں، بلکہ اپنے اعمال کے بدلے ملنے کا اندیشہ ہے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے کہ لا لی ولا علیّ، حالانکہ تمام امت ان کے کارناموں پر رطب اللسان ہے۔"

ایک مرتبہ فرمایا:۔

"اللہ تعالیٰ کا خوف سانپ بچھو کے خوف کی طرح نہیں بلکہ محبوب کی ناراضگی کے خیال کی طرح ہے۔"

ایک طالب نے عرض کی: "حضرت درد دل کس طرح حاصل ہو؟" فرمایا:

جو آج لذت درد نہاں کا جویا ہے — وہ پہلے سوز سے دل کو تو داغدار کرے

ابھی تو مشق فغاں کنج میں ہزار کرے — اثر کے واسطے کچھ اور انتظار کرے

پھر ارشاد فرمایا: محبت نہ ہونے کی حسرت بھی بڑی نعمت ہے۔

محبت تو اے دل بڑی بات ہے — یہ کیا کم ہے اس کی جو حسرت ملے

یہی زندگی جاودانی بنے — جو آب حیات محبت ملے

ترے عشق کے غم کی دولت ملے — تو سارے غموں سے فراغت ملے

اس کے بعد فرمایا: "اس کی خواہش ہو تو اہل اللہ کی صحبت اختیار کرے، محبت خاصان خدا کے قلوب کا خاص نور ہے......" جس طرح آتشی شیشے کی سوزش کے اثر سے کاغذ جل اٹھتا ہے اچقاق کی رگڑ سے آگ پیدا ہو جاتی ہے، ان ربانی آئینوں (اہل دل کے قلوب) کے مقابل جو دل بھی شوق و طلب لیکر آتے ہیں، وہ محبت کے نور سے جگمگا اٹھتے ہیں، اہل اللہ کے قلوب بھی خدا جانے کیسی قوت رکھتے ہیں، جن کی ایک ہی نظر زندگی کو پلٹ دیتی ہے۔

اک نظر میں کچھ سے کچھ ہے میری دنیائے حواس — ہوش جو تھا بیہشی ہے بیہشی اب ہوش ہے

ایک مرتبہ تسبیحات فاطمہؓ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "سبحان اللہ" کا مطلب ہے، کہ وہ تمام کمیوں سے بری اور پاک ہے، "الحمدللہ" کا مطلب ہے کہ تمام محبوبیتیں اور خوبیاں اللہ ہی کے لیے ہیں، جب یہ کہا جاتا ہے تو محبت سے جی چاہتا ہے کہ چمٹ جائے، لیکن آگے اللہ اکبر کہہ کر یہ بتایا گیا کہ وہ اتنی بڑی ذات ہے کہ وہاں یہ بات ممکن نہیں،

پاؤں تو حد ادب سے عشق سے باہر نہ رکھ — وہ ہمہ خوبی و محبوبی سراپا ناز ہے"

اگرچہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی ذات با کمال اپنی دلستانیوں کی بنا پر سالک کے لیے سراپا جمال

محبت ہے۔ مگر جلالِ الٰہی کا تصورِ عشق کو ان حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتا، جو فانی اور مجازی محبتوں کا خاصہ ہے، بلکہ محبت الٰہی خشیت الٰہی و تقویٰ کے ساتھ مقرون ہوتی ہے کہ سب سے بڑے عاشقِ ربانی محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

اما واللہ انی لاتقاکم للہ واخشاکم لہ — خدا کی قسم میں تم میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا لحاظ[1] کرنے والا اور اس سے ڈرنے والا ہوں۔

اس لیے معرفت الٰہی حضرت حق کی بارگاہ قدس میں جرأت و دلیری نہیں سکھاتی، بلکہ خشیت و عبدیت کی تعلیم دیتی ہے، حضرت شیخ قدس سرہٗ فرماتے تھے، "محبت و خشیت کی دوگونہ کیفیت (کا مقصد ہونا) اس آیت سے بھی مفہوم ہے "قابل التوب شدید العقاب" اللہ تعالیٰ سے رجا عمل کے ساتھ جمع ہوتی ہے۔ بغیر عمل رجا نفس کا فریب، شیطان کا دھوکا اور کید ہے، عمل کرتے ہوئے لرزاں و ترساں رہے کہ نہ معلوم قبول ہو یا نہ قبول ہو، والدین کی نافرمانی کرتے ہوئے ان کی مہربانی اور محبت کی امید رکھنا حماقت ہے"، کیونکہ مطلوب عقلی و شرعی محبت ہے، جس کا خاصہ پابندی احکام ہے، اور اس کی ترقی بھی اعمال صالحہ اور اوامر الٰہیہ کے ظاہری و باطنی امتثال پر منحصر ہے، طبعی محبت گو ایک نعمت ضرور ہے، لیکن اس کی بقا اور مقبولیت کا انحصار بھی کتاب و سنت کے اتباع و فرمانبرداری پر ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔"

اسی طرح محبت کا استغراق بھی مقصود نہیں، بلکہ غلبۂ محبت کے باوجود ہوش و حواس کی بقا اور احکام الٰہی کی کامل فرمانبرداری مطلوب ہے، حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک طالب کو تحریر فرماتے ہیں:

"باقی جو آپ کی تمنا ہے کہ آپ کو عشق الٰہی اور عشق رسول ملے اور اس میں استغراق ہو جائے تو جہاں تک تمنا کا تعلق ہے، مناسب ہے، لیکن یہ سمجھنا کہ آپ کو عشق الٰہی اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] تقویٰ کا ترجمہ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے "لحاظ" کیا تھا، جو اس موقع پر خوب جچتا ہے۔ (اشرف)

حاصل نہیں، صحیح نہیں، ہر مومن کو اس کا مرتبہ کچھ نہ کچھ حاصل ہے، اور آپ کی یہ صورتِ تمنا اس کی دلیل ہے، البتہ اس میں ترقی اعمال خیر میں ترقی ہی سے ممکن ہے، جس قدر اعمال میں ترقی ہوگی اور محبوب حقیقی کے احکام کی تعمیل میں ترقی ہوگی، اسی قدر اس مرتبہ میں ترقی ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ

باقی استغراق اور انہماک کی طلب تو یہ ناسمجھی سے ہے، استغراق و انہماک کمال نہیں، جناب حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم اس سے پاک تھے، آپ غور کریں کہ کسی محبوب کے احکام کی تعمیل میں دیوانہ پن اور بے خبری دلیل کمال ہے۔ یا ہشیاری اور بیداری کمال کی دلیل ہے، سنا ہے کہ انگریز سپاہی شراب میں مست ہو کر لڑتا ہے، اور پٹھان پوری ہشیاری اور بیداری سے۔ بتائیے، ان دونوں میں شجاعت اور بہادری کا اعلیٰ نمونہ کس میں ہے"۔

اسی خط میں اسی طالب کو اس شکایت کے جواب میں کہ طبعی کمزوری کی بنا پر بعض اوقات دوسروں کے اصرار کی وجہ سے لغزش ہو جاتی ہے"۔ ارقام فرمایا:۔

"کسی شخص کے کہنے یا اصرار سے کام کرنا اگر امر مباح ہو، یعنی شرع سے اس کی اجازت ہو، تو خیر کسی مسلمان کی خوشی کے ثواب کی نیت سے کر سکتے ہیں، لیکن وہ امر اگر غیر مباح اور ناجائز ہے تو کسی حال میں اس کا کرنا درست نہیں، لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق"۔ دوسرے جس شخص کے اصرار سے آپ کرتے ہیں، اس کی رضا آپ کو مقصود ہوتی ہے، تو آیا رضائے الٰہی مقصود ہونا چاہیے یا کسی غیر کی رضا، پھر دعوائے عشق یا تمنائے عشق کے کیا معنی"۔

ایک خط میں ان ہی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپ سے استفادہ کے متعلق تحریر فرمایا:

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض و برکات ہر وقت جاری ہیں، انہی میں استفادہ کا مادہ ہونا چاہیے اور اس کی صورت حضور علیہ السلام کی محبت عقلی ہے، جس کا مظہر اتباع احکام و سنت ہے"۔

گویا محبت الٰہی اور حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بقا اور امر الٰہی کے ظاہری و باطنی اتباع

کا صلہ اور نتیجہ ہے، اس لیے عشق الٰہی جو تصوف کی روح ہے، بغیر احکام شرعیہ کی کامل پابندی کے حاصل نہیں ہوتا" "جس کے دل میں یہ چراغ طور روشن ہوجاتا ہے، اس کا دل سرمدی کیف و یقین کی دولت سے مالامال ہوجاتا ہے، شکوک و شبہات کے اوہام، بے یقینی و تذبذب نورِ ایمان کی روشنی سے کافور ہوجاتے ہیں، اللہ تعالیٰ خود بھی بڑا رؤف و رحیم ہے، اس کے در پر جو بھی درد دل کی سوغات لے کر حاضر ہوتا ہے، نامراد نہیں لوٹتا، اس کا دریائے فیض تو ہر وقت جاری ہے، نگاہ لطف تو بہانہ تلاش کرتی ہے

وہ چشم محبت تو جویائے محبت ہو ۔۔۔ دیکھے تو ذرا کرکے اس سے کوئی یارانہ

حضرت والا ایک دل شکستہ طالب کو تحریر فرماتے ہیں:

"مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، اللہ تعالیٰ سراسر امید ہیں، وہ رؤف و رحیم ہیں"

ایک طالب کو جس نے اپنے حالات میں کوتاہی اور کمی کا تذکرہ کیا تھا، تحریر فرماتے ہیں:

"آپ نے اپنے موجودہ حالات جو لکھے ہیں، وہ بے شبہ گذشتہ سے فروتر ہیں، مگر کوئی مایوسی کی بات نہیں، بحمد اللہ تعالیٰ جب تک قلب میں اپنی کمی اور پستی کا احساس اور بہتر حالت و کیفیت کی طلب کا جذبہ ہے، روح کی زندگی کی نشانی باقی ہے، اور جب تک یہ کیفیت باقی ہے، علاج بہت آسان اور حالات امید افزا ہیں،

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ ۔۔۔ . . . .

ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست ۔۔۔ صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

اللہ تعالیٰ گنہگاروں کو بھی اپنا بندہ کہتا ہے اور ان کو مایوسی سے روکتا ہے،

یا عبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم ۔۔۔ اے میرے وہ گنہگار بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے

لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ۔۔۔ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔

اللہ اکبر! یہ کیسی نوید جانفزا ہے، بس اتنی دیر ہے کہ بندہ استغفر اللہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ پڑھ کر پھر اپنا کام شروع کردے، پھر وہی بخششیں ہوں گی اور وہی نوازشیں ہوں گی،

غور کیجئے! اگر بادشاہ سے ملاقات نہ ہو، تو ایک درجہ کی محرومی ہے، لیکن دربار میں باریابی کے بعد پھر وہاں سے فرار، اور کسی دوست سے دوستی بڑھاکر پھر انقطاع نہ صرف اپنی محرومی بلکہ اس بادشاہ کی ناراضی اور اس دوست کے ملال کا باعث ہے"۔

اس طویل اقتباس سے معلوم ہوا کہ محبوب ازلی تو خود سراپا رافت و رحمت اور جویائے محبت ہے، اگر انسان کی طرف سے معمولی کوشش بھی ہو تو توفیق خداوندی دستگیری فرماکر عطا سے مالامال کردیتی ہے،

ان کے کرم کے ہم نثار، انکی عطا کا کیا شمار ۔۔۔ دیدیا عاصیوں کو بار اپنے حریم ناز میں"

حضرت شیخ قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے "وصول تو ہر ایک کا جذب ہی سے ہوتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ کوئی راہ سلوک کو پہلے طے کرتا ہے، کوئی بعد میں،

انھیں کے دینے سے ملتا ہے جس کو ملتا ہے

حضرت سیدی قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ "بندہ اگر کوشش کرے تو وہ ہدایت کے لیے اسے خود قبول فرمالیتے ہیں، جیسے بچہ اگر قدم اٹھائے اور دو چار قدم چل کر گرجائے تو ماں باپ پیار سے خود اٹھالیتے ہیں، اسی طرح اللہ میاں بھی گود پھیلائے ہوئے ہیں کہ میرا کون سا بندہ میری طرف آتا ہے کہ اسے میں اپنی رحمت سے قبول کرلوں"۔

ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں: "کام میں لگے رہیں، منزل مقصود تک تو رسائی انشاء اللہ تعالیٰ ایک دن ہو ہی جائیگی"۔

منتظر بیٹھا ہوا جو بھی تری محفل میں ہے ۔۔۔ آ ہی جائیگا کبھی اس تک بھی ساقی دورِ جام

اجتہاد کا راستہ انکی خصوصی رحمت و عنایت کا راستہ ہے، انابت کا راستہ عام سنت الٰہی ہے، اسلیے بندے کو چاہیے کہ عام راستے

یعنی انابت والے راستے کو اختیار کریں تو انشاء اللہ ہدایت تو نصیب یکدن ہو جائیگی، اپنا کام کوشش دینی ہے نوازنا انکا کام ہے۔"

اس سلسلے میں حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ یہ چیز خاص طور پر فرمایا کرتے تھے کہ "ہم طلب و کوشش کے مکلف ہیں، وصول کے نہیں، اس لیے سالک کے لیے ہمت کر کے کوشش کر لینا ہی کافی ہے، اس راستہ میں ہر قدم راہ بھی ہے اور منزل بھی، ذریعہ بھی اور مقصد بھی، یعنی اپنی ہمت و کوشش سے رضائے الٰہی کی جستجو میں لگا رہے اور اس راستہ میں جتنی گھاٹیاں آئیں گی، وہ وصول کا ہی حکم رکھیں گی، کیونکہ سالک کا کام صرف محنت اور جستجو ہے، حضرت والاؒ فرماتے ہیں:

جد و جہد ہر پہر ذوق و شوق لطف دید — حاصل ہر سعی میری سعی لاحاصل نہیں ہے
منزل مقصود ہے راہ طلب کا ہر قدم — وہ سر منزل ہو جو اب تک رہ منزل میں ہے
ہر ضرب تیشہ ساغر کیف وصال دوست — فرہاد کی جو بات ہے مزدور کی نہیں

بعض سالکین 'وصول' کی فکر میں ذریعۂ 'وصول' سے ہی غافل ہو جاتے ہیں، حالانکہ وصول اختیاری نہیں اور انسان غیر اختیاری امور کا مکلف نہیں، اس لیے کوشش کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید کامل رکھنی چاہیے، وہ کسی کی طلب اور محبت کو ضائع نہیں کرتی اور نجات کی کوئی نہ کوئی راہ نکال دیتی ہے۔ ایک طالب نے لکھا "ان کی رحمت ہی کا محتاج ہوں، ان ہی سے امید ہے کہ اس نااہل سے کرم والا معاملہ فرمائیں گے"۔ اس کے جواب میں سیدی حضرۃ الشیخ قدس سرہٗ نے تحریر فرمایا "انشاء اللہ تعالیٰ۔ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ حسن ظن ہی رکھنا چاہیے 'انا عند ظن عبدی بی' کا منشا یہی ہے"۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، مقصد یہ تھا کہ حب الٰہی اور خشیت الٰہی کے جذبات کے ساتھ انسان ایمان کی زیادتی اور اعمال صالحہ کی بجا آوری میں لگا رہے، تو انشاء اللہ تعالیٰ منزل مقصود تک رسائی ہو ہی جائے گی، مگر راستہ میں منزل تک پہنچنے کی بیتابی نہیں چاہیے اور وصول کو مقصد

سمجھنا چاہیے، ذرائع وصول یعنی ایمان باللہ اور اعمال صالحہ کی بجا آوری میں لگا رہے، وہ خود ہی کبھی نہ کبھی شرف قبول سے نوازیں گے، صدیقین و مخلصین تو اس کی رضا و طلب میں اپنا سب کچھ قربان کر دینے ہی کو وصول و فوز سمجھتے تھے۔

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب — کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

ذکر و تہجد و نوافل | طریق محبت کے راہی چونکہ مجلہ نشین ازل کے شیدائی ہوتے ہیں، اس لیے ان سوختہ سامانوں کا زاد راہ یاد حبیب اور توشہ درد و سوز ہوتا ہے، محبوب کی یاد میں ہر دم مگن۔ اس کے نام سے ان کی زبانیں تر، اور اس کے دھیان سے ان کے قلوب ڈر و حیں پر نور ہوتی ہیں، منشائے حبیب پر وہ جانیں قربان کرتے ہیں، اور اس کے اشاروں پر ان کی ہر حرکت موقوف ہوتی ہے، ان کی زندگی میں اس کے اوامر سے ہی جان آتی ہے، اور اس کے مشاہدہ سے ہی وہ قرار پاتے ہیں، اس لیے ان محبین صادق کی راہ پر جو گامزن ہونا چاہے، اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ ان کا طریق اختیار کرے، یاد الٰہی سے اپنا ہر سانس اور قیام و سجود سے اپنی ہر رات زندہ رکھے، عبدیت کاملہ اس کا مشغلہ ہو، اور فنائے تام اس کا حال کہ الٰہی رنگ بندگی کے کمال سے ہی حاصل ہوتا ہے، صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ۔ ونحن لہ عٰبدون میں اسی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

بہر حال بندگی و عبدیت، اطاعت و فرمانبرداری کے کمال کے ساتھ ذکر دائم و قیام لیل طریق کا ضروری جزو ہیں، حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک والا نامے میں ارقام فرماتے ہیں:

"تہجد اور ذکر یہ دونوں اس طریق کی ضروری چیزیں ہیں، ان پر مداومت رکھیے"۔

دوسرے گرامی نامے میں تاکید فرماتے ہیں:

"آپ تہجد اور نوافل اوابین ۶ رکعات بعد سنت مغرب اور ۴ رکعات اشراق جب

آفتاب نکل کر بلند ہو جائے، تہجد میں ۶ رکعات سے ۱۲ رکعات تک نصف شب کے بعد (پڑھا کریں)

ایک دوسرے طالب کو تحریر فرمایا "تہجد کا اہتمام جاری رکھیں"۔

ایک اور صاحب کو تہجد وغیرہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"معمولات کی تکمیل کی کوشش میں لگے رہیے، وقت کی پابندی کے بغیر معمولات ناغہ ہوتے ہیں، اس لیے وقت کی پابندی کی ضرورت ہے، رات کو نہ ہو سکے تو ظہر کے بعد سہی، تہجد میں اٹھا نہ جا سکے تو اس کی دو تدبیریں ہیں، ایک یہ ہے کہ عشا کی نماز و سنت پڑھنے کے بعد لیکن وتر سے پہلے دو دو رکعت صلوٰۃ اللیل کی نیت سے پڑھ لیں، دوسری یہ کہ اشراق و چاشت کے وقت تہجد کی قضا پڑھ لیں"۔

ان ہی کو دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"معمولات کی ادائی اور تہجد کی پابندی ہو جاتی ہے تو بڑی بات ہے"۔

ان ہی کے ایک اور خط میں یہ تحریر ہے کہ:

"خوشی کی بات ہے کہ آپ تہجد پڑھتے ہیں، پہلے جب کبھی آپ کو تہجد کا موقع ملتا تھا، اس وقت دعا کی طرف جو توجہ اور جو گریہ ہوتا تھا، وہ کبھی کبھی پڑھنے کی وجہ سے تھا، اب مداومت سے پڑھنے پر جو وہ کیفیت روزانہ نہیں ہوتی تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

یہ ایسے ہی ہے کہ جس کو کبھی کبھی پلاؤ کھانے کو ملتا ہے تو اس میں اس کو بہت مزہ ملتا ہے۔ لیکن جب وہی غذا کسی کو روزانہ ملنے لگے تو وہ مزا نہیں ملتا، مساوات ہو جاتی ہے، پھر گریہ سے تہجد کی مداومت ہزار درجہ بہتر اور شکر کے قابل ہے"۔

ذکر اور طریق تو لازم و ملزوم ہیں، اس لیے مسترشدین کو اس کی تاکید بکثرت فرمائی گئی ہے، چند اقتباسات ملاحظہ ہوں، ایک طالب کو تحریر فرماتے ہیں:

"آپ پندرہ منٹ مراقبہ کے لیے وقت نکالتے ہیں، اگر کچھ وقت اور ملے، جیسے صبح کی نماز

کے وقت یا تہجد میں یا کسی اور وقت تو ایک ہزار دفعہ اَللّٰہُ اَللّٰہ ذرا ہلکے نغمہ سے آہستہ آہستہ اس حد تک کہیں کہ آپ کے کان میں آواز آئے، تسبیح پر گن کر ذکر کر لیا کیجئے، آنکھیں بند ہوں، اور یہ تصور ہو کہ اللہ کا کلمہ نورانی حروف میں آپ کے سینہ پر لکھا ہے، اگر آپ تعلیم یا کسی اور کام میں مصروف ہوں تو اس میں نقصان نہ ہو، ہر کام میں خدا کی رضا کی نیت رہے، انشاء اللہ تعالیٰ آپ کے لیے دین کا راستہ کھلے گا"۔

دوسرے والا نامے میں ان ہی کو تحریر فرمایا:

"اللہ تعالیٰ آپ کو برکت عنایت فرمائیں، اسی طرح وقت اور فرصت کے ساتھ ساتھ اس ذکر کی تعداد کو بڑھاتے جایئے، بشرطیکہ کسی دوسرے ضروری کام میں حرج نہ ہو"۔

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:-

"ہر وقت ذکر کی مصروفیت یعنی دوام ذکر قلب بڑی نعمت ہے جو آپ کو مل رہی ہے، اسکو جاری رکھیے"۔

دوام ذکر اور کثرت اعمال صالحہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

"یہ بھی ذہن میں رہے کہ کشف والہام وغیرہ محض محمود ہیں، مقصود نہیں، ان باتوں کو قرب الٰہی میں کوئی دخل نہیں ــــ قرب الٰہی صرف ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ ہیں، اس لیے دوام ذکر اور کثرت اعمال صالحہ کی فکر میں رہنا چاہیے"۔

ان ہی کو تاکید کرتے ہیں: "کیفیات واحوال کی طرف توجہ نہ کیجئے، اور صرف حسن عمل و کثرت ذکر کی طرف توجہ رکھیے"۔

ایک اور گرامی نامے میں تسلی دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تعلیم کے مشغلہ کی نسبت یہ خیال کریں کہ یہ حصول رزق کی کوشش ہے، اس نیت سے یہ تعلیمی جد و جہد بھی عبادت ہی میں شمار ہو گی، با ایں ہمہ اوقات نماز و نوافل و ذکر قائم رکھیں، انشاء اللہ تعالیٰ یہ نعمت (یعنی دوام ذکر) آپ کو حاصل رہے گی"۔

ان اقتباسات سے ذکر کی اہمیت واضح ہو گئی ہو گی۔ حضرت شیخ کی صحبت میں جنھیں بیٹھنے

کی سعادت نصیب ہوئی ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان پر ذکر کا کس قدر غلبہ تھا، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بے ساختہ زبان اقدس سے لا الہ الا اللہ یا اللہ اللہ کی صدا نکل جاتی تھی، خود فرماتے ہیں:

کس نے بھر دی یہ صدائے دلنواز ہر رگِ جاں ساز الا اللہ ہے
کوئی ہو آواز میرے کان میں ہر صدا آواز الا اللہ ہے
ہے اسی کی سانس انفاسِ حیات جو کوئی دم ساز الا اللہ ہے
دل سے ہوتا ہو ترانہ خود بلند قلب ذاکر ساز الا اللہ ہے
وجد میں جاں ہو تو اعضا رقص میں جام مے آواز الا اللہ ہے

ایک مرتبہ ایک طالب سے جس کے قلب سے بے اختیار "اللہ اللہ" کی صدا نکل جاتی تھی، ارشاد فرمایا "گو یہ کیفیت مجھے بھی پیش آتی ہے، لیکن اصل ارادہ اور زبان سے ذکر کرنا ہے، تاکہ ذاکر اس خیال سے کہ ذکر قلبی جاری ہے، ذہول میں مبتلا نہ ہو جائے، اس کے علاوہ نئے ارادہ کے ثواب سے محروم نہ رہے"

حضرت شیخ نے اپنی اس حالت کا ذکر ایک شعر میں فرمایا ہے،

نام ان کا ہر نفس میں لب پہ یوں آیا کیا تن سے جیسے روح بسمل مائلِ پرواز ہے

ایک مرتبہ فقیر نے عرض کیا کہ "حضرت ذکر کس طرح کرنا چاہیے"۔ ارشاد ہوا:

"نالہ پابند نہیں ہے"

پھر فرمایا: "وہ طرز نالہ ہو جو ان کو بے قرار کرے۔"

میرا ایک شعر ہے:

وہ اپنے کانوں سے سنتے ہیں میرے نالوں کو وہ طرز نالہ ہو جو ان کو بے قرار کرے

ایک مرتبہ سفر میں حضرت قدس سرہٗ اور فقیر کا ایک ہی کمرہ میں قیام تھا، پچھلی رات میں نطق سلیمانی نے حبِ داؤدی لے میں "الا اللہ، الا اللہ" کا نغمۂ ملکوتی ساز میں چھیڑا تو در و دیوار پر وجد کی کیفیت تھی۔

اور سننے والا اپنی ہستی کو نغماتِ قدس میں گم کر چکا تھا۔

کیا بھری تاثیر میں مطرب کی آواز ہے جو تری محفل میں بیٹھا وہ سراپا ساز ہے

حضرت والا ذکر میں اصل توجہ مذکور کی طرف قرار دیتے تھے، اور اگر مذکور کی طرف نہ ہو سکے تو ذکر کی طرف۔ ایک طالب نے لکھا "قلب کو سکون صرف توجہ الی اللہ سے ملتا ہے، اور اس وقت الفاظ ذکر بھی منقطع کر دینے پڑتے ہیں، صرف توجہ سے دل کی سیاہی مٹتی محسوس ہوتی ہے"۔ حضرت شیخ قدس سرہٗ نے جواب میں ارقام فرمایا:

"ذات کی طرف توجہ اصل ہے، اگر اس حالت میں معانی و الفاظ کا استحضار نہ رہے تو کوئی حرج نہیں، اصل توجہ مذکور کی طرف ہونی چاہیے، یہ نہ ہو تو ذکر کی طرف۔"

ایک طالب نے لکھا کہ "پچھلے کچھ دنوں سے قلب میں سوز کی ایسی کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ مستی کی کیفیت محسوس ہوتی ہے، اور عشقیہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے، اور اس سے تسکین ہوتی ہو، ذکر بھی جو کہ ہمیشہ خفی کرتا ہوں (الا ماشاء اللہ) جہری کرنے کو جی چاہتا ہے"۔ جواب میں ارقام فرمایا:

"یہ کیفیت مستحسن و محمود ہے، ذکر جہری کرنے یا عشقیہ اشعار پڑھنے کو جی چاہے تو پڑھ لیں، خواجہ مجذوبؔ کے اشعار اس کے لیے مفید ہیں۔"

وساوس و لاطائل خیالات عموماً سالکین کو ذکر و نماز و تلاوت وغیرہ کی حالت میں تنگ کرتے ہیں، اور سالک کو اپنے میں پھنسا کر اللہ تعالیٰ کے دھیان اور اس کی یاد و مناجات سے غافل کر دیتے ہیں، ہمارے حضرت قدس سرہٗ کے نزدیک وساوس کا علاج ان کی جانب عدم التفات ہے، انکی طرف جتنا دھیان کیا جائے گا، اتنے ہی بڑھیں گے، اس کا علاج صرف یہ ہے کہ وساوس و خیالات سے توجہ ہٹا کر ذات باری تعالیٰ کی طرف یا الفاظ و معانی کی طرف کر لیجائے۔ وساوس کا آنا برا نہیں کیونکہ غیر اختیاری امر ہے، البتہ اس کا لانا برا ہے، سالک کو چاہیے کہ ان تمام خیالات سے یکسو ہو کر ایک ذات

کی طرف توجہ ہو جائے، اور کسی کی طرف التفات نہ ہو، پھر ہزار وسوسے آئیں تو بھی مضر نہیں، کہ اپنا کام صرف ان کی طرف عدم التفات ہے۔

دور باش افکار باطل دور باش اغیار دل	سج رہا ہے شاہ خوباں کیلیے دربار دل

ایک مرتبہ راقم سے فرمایا کہ "مجھے حضرت والا (یعنی مولانا تھانوی) رحمہ اللہ تعالیٰ نے ابتدائی خط میں یہ جملہ لکھا تھا کہ 'وساوس کا لانا منع ہے، آنا منع نہیں'۔"

حضرت شیخ فرماتے تھے کہ "وسوسہ تو شیطان ڈالتا ہے، اور اس لیے ڈالتا ہے کہ سالک کو تکلیف ہو، حضرت مولانا تھانویؒ نے لکھا ہے کہ اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ فرماتے تھے کہ ان وساوس کو مرآۃ جمال حق بنایا جائے کہ یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان ہے، کہ اس نے قلب کو ایسا بنایا کہ اس میں طرح طرح کی چیزیں اور خیالات آتے جاتے ہیں، جب ان وساوس کو ذات حق کے دھیان اور قرب کا ذریعہ بنا لیا جائے گا تو شیطان وسوسہ ڈالنا چھوڑ دے گا" کہ اس کا مقصود تو ذات حق سے ہٹانا تھا، اور جب وساوس خود ذات کی طرف توجہ کا ذریعہ بن گئے تو اسکا مقصد کہاں پورا ہوا، اور قلب پر جب حضرت حق کا دھیان چھا جاتا ہے تو تمام وساوس خود بخود دور ہو جاتے ہیں، اسی کے متعلق کہا گیا ہے:

کشاکشہائے رنگا رنگ سے چھوٹوں تو قرار آئے	مقیم اس گھر میں ہو جائے اگر یہ میہمان دل

حضرت قدس سرہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"وساوس کا واقع ہونا مضر نہیں، جو روہیں آتے ہیں، جہاں دولت ہوتی ہے، شیطانی وساوس کے آنے کو بھی ایسا ہی سمجھا جائے، اور ان کی طرف سے ذہن کو پھیر کر اللہ تعالیٰ کی طرف کر لیا جائے، عدم التفات ہی اس کا علاج ہے"۔

بعض اوقات سالک اپنے خیالات واوہام کی بوقلمونیوں اور حجابات نورانی کی دلفریبیوں

میں الجھ کر ذکر سے غافل ہو جاتا ہے، اس کے متعلق حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ "اصل یہ ہے کہ ان سب کو قلب سے خارج کر کے یوں سمجھے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہوں، وہ سن رہے ہیں، دیکھ رہے ہیں، جواب دے رہے ہیں، جیسا کہ خود ارشاد ہے ادعونی استجب لکم، اذکرونی اذکرکم، اس لیے انسان یقین کے کانوں سے کیوں نہیں سنتا کہ جب وہ اللہ اللہ کہتا ہے، تو اس کا جواب 'عبدی عبدی' دیا جاتا ہے، حضرت اُبَیؓ رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کیا، کہ تمہارا نام اللہ تعالیٰ نے لیا ہے، تو فرط شوق ومحبت میں رو پڑے کہ میرا نام اللہ تبارک وتعالیٰ نے لیا ہے، اور یہیں اللہ تبارک وتعالیٰ خود کہتے ہیں کہ تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا، پھر ہمیں کیوں یقین نہیں آتا کہ جب ہم 'اللہ اللہ' کہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ 'عبدی، عبدی' کہکر ہمارا جواب دیتے ہیں"۔

اگر سالک رویت الٰہی، سماعت الٰہی، قربت الٰہی کے یقین و ادعا کیساتھ انکا حق سمجھکر ذکر کرے تو اس کے اثرات وبرکات سے ضرور سینہ ودل سراپا نور ہو جائے گا، اور تمام خیالات واوہام خود کافور ہو جائیں گے، ایسے ہی ذکر کے متعلق حضرت شیخ قدس سرہ فرماتے ہیں:

نام لیتے ہی نشہ سا چھا گیا	ذکر میں تاثیر دور جام ہے
دیکھنا ہو تو نگاہ شوق میں	اس کی ہر سو بارگاہ عام ہے
بزم میں تنہا نظر آتا ہوں میں	ایک میں ہوں اور خدا کا نام ہے

اور بھی مٹ جائیگی تاریکی افکار دل	خانۂ دل میں جو پھیلینگے کبھی انوار دل
جمع وہ سامان ہو جس کی خریداری بھی ہو	سوچ کر اپنا دل لگانا چاہیے بازار دل

ذکر حق سے صیقل کامل ہوا	محو دل سے نقش ہر باطل ہوا
چار جانب بارش انوار ہے	جلوہ فرما وہ مہ کامل ہوا

لذت کو قرب میں کوئی دخل نہیں

سالکین کو اس راہ میں ایک اور سخت گھاٹی یہ پیش آتی ہے کہ وہ مختلف اذکار و احوال کی لذت کی طلب میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور اس کے حاصل نہ ہونے پر ناکامی کا گمان کر بیٹھتے ہیں، حضرت سیدی و مولائی اس لذت طلبی کو سالکین کے حق میں انتہائی خطرناک سمجھتے تھے، ایک طالب سے جو اذکار و نماز وغیرہ میں لذت نہ ملنے پر رنجیدہ تھے، احقر کی موجودگی میں فرمایا: لذت کو قرب میں کوئی دخل نہیں، یہ دو دھاری تلوار ہے اور بڑے خطرے کی چیز ہے۔" طالب نے عرض کیا" بغیر لطف و لذت کے عمل مشکل ہو جاتا ہے"، فرمایا" یہ تو ازالۂ مشکل لذت کے لیے ہو گیا، اللہ تعالیٰ کیلیے نہیں ہوا، ممکن ہے ایسا شخص لذت کے لیے نماز پڑھ رہا ہو، اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے نہ پڑھ رہا ہو" پھر فرمایا" یہ عامیانہ تصوف کہاں سے سیکھ لیا، یہ تو گڑ کے لیے نماز پڑھنا ہو گیا"، پھر اپنے چند اشعار پڑھے۔

ترے نام ہی میں حلاوت ملے — جو ذوقِ محبت کی لذت ملے

جو تیری رضا کی بشارت ملے — تو دونوں جہانوں کی راحت ملے

محبت تو اے دل بڑی بات ہے — یہ کیا کم ہے اس کی جو حسرت ملے

بہر حال بندے پہ ہے بندگی — کرم ہے جو ذوقِ عبادت ملے

ترے عشق کے غم کی دولت ملے — تو سارے غموں سے فراغت ملے

اور فرمایا" بس طالب مولیٰ بنیئے، طالب لذت نہ بنیئے، دوا سے صحت مقصود ہو، دوا کی لذت مقصود نہ ہو، حکیم کو منتخب کیا جائے تو اس سے یہ نہ کہا جائے کہ خمیرہ گاؤزباں لکھ دے، اگر وہ چرائتہ لکھ دے تو آپ کو یہ حق نہیں ہے کہ اس سے منع کریں،

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش — کہ ہرچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

ایک دوسرے صاحب نے ایک موقع پر فقیر کی موجودگی میں عرض کیا" حضرت بعض اوقات ذکر ذوق و شوق سے ہوتا ہے اور بعض اوقات پتھر سا دل معلوم ہوتا ہے، کچھ اثر معلوم نہیں ہوتا"۔ فرمایا:

" یہ احوال ہیں جو بدلتے رہتے ہیں، ان کی فکر کی ضرورت نہیں، اصل چیز تو مقامات ہیں، معلوم ہوتا ہے ابھی تک آپ ان کیفیات و لذات وغیرہ کے چکر سے نہیں نکلے، ان ہی میں پڑے ہوئے ہیں، کشف، لذت، کچھ نظر آنا یہ چیزیں التفات کے قابل نہیں، مقامات کو حاصل کرنے کی کوشش کیجیے، صبر و شکر رضا وغیرہ، توجہ و کوشش کے قابل تو یہ چیزیں ہیں، غیر اختیاری امور کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے، جب تک ان چیزوں سے نہ نکلا جائے، مقصود کا پتہ نہیں چلتا، غیر مقصود کو مقصود سمجھ لینا سب سے بڑی غلطی ہے"۔

ایک گرامی نامہ میں ارقام فرمایا:۔

" ذکر میں لذت کی تلاش اور اس کے نہ ملنے پر مردودیت کا شبہہ اس راہ کا سخت پتھر ہے، اگر اس ذوق کا جاتا رہنا گناہ کے سبب سے نہ ہو تو مضر نہیں۔ اور یوں بھی کل جدید لذیذ" کے اصول سے ایک مدت کے بعد اس کا مزہ باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ اغذیۂ مادی کا حال ہے، لیکن ظاہر ہے کہ لذت ملنے نہ ملنے پر تولید خون موقوف نہیں، وہ صرف ہضم ہونے والی غذاؤں سے بنتا ہے، آپ اپنی طرف سے کوشش کر کے غذا کھائے جائیں، اور نتیجہ کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں"۔

ایک دوسرے مکتوب میں ہے:

" لذت گو ایک نعمت ضرور ہے، لیکن اس کو قرب الٰہی میں کوئی دخل نہیں"۔

اس سے ظاہر ہوا کہ ذکر و عبادت، لطف و لذت وغیرہ کے جذبات سے خالی ہو کر صرف رضائے الٰہی کے لیے کرنا چاہیے، کہ خلوت خانۂ دل میں سوا اس کی یاد کے کچھ بھی نہ ہونا چاہیے، لذت تو صرف اس میں ہے کہ صرف اس کے لیے اس میں شاغل ہو کر اسی کے جلووں سے لطف اندوز ہو، لذت ملی تو کیا نہ ملی تو کیا۔

نماز

نماز مومن کی معراج اور بقول حضرت مجدد سرہندیؒ اس عالم میں قرب الٰہی کا انتہائی مقام ہے، مومن کی زندگی جس قدر نماز سے متاثر ہوتی ہے کسی دوسرے عمل سے نہیں ہوتی، بلکہ بعض عارفین کے

قول کے مطابق نماز مومن کی زندگی کا آئینہ ہے، جس قدر نماز کامل ہوگی، اسی قدر زندگی عبدیت کاملہ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوگی، نماز کا ظاہر و باطن پوری زندگی کے ظاہر و باطن کی عکاسی کرتا ہے، نماز میں جن پر خشوع طاری ہوتا ہے، وہ ہر عمل میں خاشع ہوتے ہیں، نماز کی جھکی ہوئی نگاہیں محارم کو بھی دیکھ کر جھک جائیں گی، لغو باتوں سے بے توجہی ان ہی کانوں کو نصیب ہوگی جو عالم کے ہنگامے سے کان بند کرکے مناجات میں سراپا گوش ہوتے ہیں، جن کے دل ذاتِ حق میں نماز کی حالت میں مشغول ہوتے ہیں، وہ مجمع میں بھی اس کی جانب متوجہ رہ کر باہمہ و بے ہمہ کا منظر پیش کرتے ہیں، غرض نماز ایک ایسا عظیم عمل ہے جو مومن کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے، ہم نے اپنے اکابر سے سنا ہے کہ مومن کی پوری زندگی 'صفت صلوٰۃ' پر گذرتی ہے، اور اس میں اسی عبدیت و عبودیت، اسی امتثال اوامر و احکام، اسی اجتماع اور اتباع امیر، اسی خشوع و خضوع، اسی تعلق مع اللہ اور قربت حق اور اسی احسان و حضور کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو نماز میں ہوتی ہے، اس لیے تکمیل صلوٰۃ تکمیل مومن کا سب سے بڑا زینہ ہے، اس لیے نماز کو نماز بنانے کی جتنی سعی کی جائے گی، اتنی ہی زندگی ایمان و تقویٰ کے نور سے جگمگا اٹھے گی،

قرب بے غیبت نمازِ عاشقاں ۔۔۔ فی صلوٰۃ دائمون آرزوست

اس لیے حضرت سیدی رحمۃ اللہ علیہ نماز کی تکمیل و تحسین کی طرف طالبین کو بڑی توجہ دلاتے تھے، ایک طالب کو لکھتے ہیں:-

"نماز کا کیا حال ہے، اس میں یکسوئی اور خضوع و خشوع، جماعت اور اوقاتِ مسنونہ کی پابندی اور اتباع سنت کا شوق کہاں تک ہے؟"

ایک گرامی نامہ میں تنبیہ فرماتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:-

"نماز کشفِ اسرار اور وارداتِ قلبیہ کا محل نہیں، یہ صرف عبودیت و عبدیت، تواضع اور حضور کی کیفیت کا محل ہے، آپ ان شعبدوں کی طرف التفات نہ کریں، یہ امور قرب الٰہی میں کچھ

دخل نہیں رکھتے، اور نہ اس سے حصول ثواب ہوتا ہے، کیا دل میں راستہ کے مناظر منزل مقصود کو قریب کر دیتے ہیں، کیا یہ خیال حماقت نہیں۔"

ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:-

"ان وساوس کی طرف سے ذہن کو پھیر کر اللہ تعالیٰ کی طرف کر لیا جائے۔"

"ذات کی طرف توجہ اصل ہے، اگر اس حالت میں معانی و الفاظ کا استحضار نہ رہے تو کوئی حرج نہیں۔"

ایک مبتدی طالب کو لکھتے ہیں:-

"نماز میں وسوسے دور کرنے کے لیے یہ کیجیے کہ نماز کے الفاظ ٹھہر ٹھہر کر ارادہ کے ساتھ پڑھیے۔"

ایک گرامی نامے میں ہے:-

"نماز کی ترکیب، خضوع و خشوع پر عمل کیجیے۔"

ایک طالب کو لکھتے ہیں:-

"جماعت کی پابندی ضروری ہے کہ اس کا اہتمام رہے۔"

حضرت شیخ قدس سرہٗ نماز کے ظاہری و باطنی آداب کی پوری پابندی اور اس کو سنت کے مطابق ادا کرنے کی بڑی تلقین فرماتے تھے، راقم نے وضو کی دعائیں احیاء العلوم سے یاد کی تھیں، حضرت والا نے ایک دن پوچھا، وضو کس طرح کرتے ہو؟ میں نے بتلایا اور یہ دعائیں بھی سنائیں، حضرت کے نزدیک ان میں سے اکثر سنت سے ثابت نہیں تھیں، اس لیے مسنون دعا "اللھم اغفرلی ذنبی ووسع لی داری وبارک لی فی رزقی" تلقین فرمائی، اور تہجد کی نماز میں رکوع و سجود اور اٹھنے بیٹھنے کی مسنون دعائیں راقم سے سن کر خوشی کا اظہار فرمایا، نماز کے آخر میں وہ دعا پڑھنے کو بتائی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو تلقین فرمائی تھی، اسی طرح نوافل وغیرہ میں ان ہی سورتوں کو پڑھنا بہتر سمجھتے تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی تھیں، غرض نماز کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے مشابہ بنانے کی سعی کی تلقین ہمیشہ فرماتے تھے۔

(باقی)

اسلامی علوم اور فلسفہ کا اثر یورپ کے علوم اور فلسفہ پر

جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی لکچرار عربی الہ آباد یونیورسٹی

یہ مضمون ڈاکٹر عمر فروخ کی کتاب "اثر الفلسفۃ الاسلامیۃ فی الفلسفۃ الاوربیۃ" کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔

فاضل مترجم خود ڈاکٹر ہیں، مگر ان پر عربیت کا اثر اتنا غالب ہے کہ انھوں نے یورپین فضلا کے نام بجنسہ عربی لہجے میں رکھ دیئے ہیں، اور انکو صحیح تلفظ میں لکھنے کی زحمت نہیں گوارا کی ہے جس سے یہ نام نامانوس ہو گئے ہیں، مگر مضمون مفید ہے اسلیے اسکو شائع کیا جاتا ہے۔ (م)

اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ علوم اور فلسفہ پر عربوں کا احسان عظیم ہے، ان کی کوشش علمی چھان بین اور تفحص و تحقیق نے علوم میں چار چاند لگا دیے، لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ انسانی غور و فکر کی تاریخ میں اس احسان کا کیا مرتبہ ہے، ہم جب اس زمانہ پر نظر غائر کرتے ہیں جس میں اسلامی فلسفہ اپنی رونق اور ضیا باری سے دنیا کو روشن کر رہا تھا، تو ہم کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ عربوں نے ثقافت کا حق پورے طور پر ادا کر دیا، انھوں نے صرف انسانی فکر کے نتیجوں کو حاصل کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنے زمانہ ترقی میں ان نتائج میں اپنے مساعی سے وہ ترقیاں اور اضافے کیے جن سے دوسری قوموں کو استفادہ کا بہترین موقع مل گیا، اور عربوں نے ان معلومات کے وسیع کرنے میں ان ساری مشقتوں اور موانع کا جو انھیں پیش آئے، جرأت کے ساتھ مقابلہ کرکے کامیابی حاصل کی،

ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کی ثقافت

چھٹی اور ساتویں صدی ہجری یعنی بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں جبکہ مشرق میں صلیبی لڑائیوں کی آگ مشتعل تھی، اور طرح طرح کے فسادات رونما ہو رہے تھے، ثقافت اسلامیہ یورپ میں اپنا اثر پھیلا رہی تھی جس سے علوم و فنون کے چشمے جاری ہوتے جاتے تھے، اور

حضارت و مدنیت کا اثر یورپ میں پھیلتا جاتا تھا، اس زمانے تک یورپ جہالت کی تاریکی میں پڑا ہوا تھا، یونان و روم کے قدیم علوم کا درجہ تیسری صدی عیسوی سے متعدد وجوہ سے گھٹ رہا تھا، ان میں ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مسیحی کلیسا بہت سے ایسے علوم و آداب کا مخالف تھا جن کو وہ مسیحیت کے خلاف اور دہریوں اور بت پرستوں کی پیداوار سمجھتا تھا، اس کے علاوہ بربریوں وغیرہ کے حملوں کی وجہ سے جو چوتھی، پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں ہوئے، حضارت قدیمہ کا زوال ہو گیا، اور لوگ علوم کو بھول گئے، ہاں بعض راہب اپنے عبادت خانوں میں اور بعض علما اپنے گوشوں میں کسی پرانی نحو یا تاریخ کی کتاب کا درس دیتے تھے، اور اس کی تشریح صرف لغوی طریقہ پر کر دیتے تھے، ظاہر ہے کہ یہ فکری عمل ایک انفرادی حیثیت رکھتا تھا، اس کا اثر قوموں کی علمی زندگی اور ان کے سواد اعظم پر کیا ہو سکتا تھا،

شارلیمان نے جس کی وفات ۱۹۹ھ (۸۱۳ء) میں ہوئی ہے، امیرزادوں کے لیے اپنے محل میں ایک مدرسہ قائم کیا جس میں وہ ابتدائی تعلیم پاتے تھے، شارلیمان کی وفات کے بعد نویں اور دسویں صدی مسیحی میں ایسے سیاسی جھگڑے امرا اور کلیسا کے درمیان بلکہ خود باہم امرا میں پیدا ہو گئے جنھوں نے پرانی آبادیوں کے نشانات مٹا دیے، اور جو علوم حاصل کیے گئے تھے، انھیں معدوم کر دیا،

اس وقت یورپ کی ثقافت چار اسباب کی وجہ سے کمزور پڑ گئی،

(۱) لاطینی زبان کی سیادت۔ یہ زبان مذہبی اور پڑھنے پڑھانے کی زبان تھی، جس کو صرف علماے دین جانتے تھے، یا کچھ ایسے لوگ واقف تھے جو ان علوم پر قناعت کرتے تھے، جو دین کے احاطہ سے تجاوز نہ کرتے تھے،

(۲) جب لاطینی زبان سے قوم ناواقف ہو گئی تو اس سے علم بھی جاتا رہا، اس وقت یورپ کے باشندے علمی تاریکی میں گھرے تھے، مثلاً تاریخ کے نام سے صرف چند خیالی افسانے اور فضول اعمال

جو اسکندر مقدونی اور جولیس قیصر یا بعض بہادروں کی طرف منسوب کیے جاتے تھے، خود یورپ کی تاریخ کی یہ حالت تھی کہ اس کے واقعات دھندلے پڑے تھے، ایک واقعہ کی نسبت دو مقاموں بلکہ زیادہ کی طرف کیجاتی تھی، اور اوہام فاسدہ سے اس میں کام لیا جاتا تھا، صحیح اور حقیقی علم بالکل مفقود تھا، صرف بعض قدیم علوم جو اس زمانہ میں غلط قرار دیے جاچکے ہیں، ان میں باقی تھے، مثلاً عناصر اربعہ یا زمین کے سطح ہونے کا عقیدہ۔

(۳) خرافات کی اشاعت۔ جہل کی وجہ طرح طرح کے خرافات اور لغو اعتقادات رائج ہوگئے تھے، مثلاً نجوم اور سحر کا عقیدہ یا یہ اعتقاد کہ انسان کے بدن میں امراض شیطان کے داخل ہونے سے پیدا ہوتے ہیں، یا ایسے حیوانات موجود ہیں جن کے چہرے کتے کے ہیں اور باقی جسم انسان کا۔ یا ایسے حیوانات جن کے سینے انسان کے ہیں اور پاؤں بکریوں کے، یا یہ کہ بعض مخلوقات کے ایک آنکھ پیشانی کے بیچ میں ہوتی ہے، یا دو آنکھیں دونوں مونڈھوں میں ہوتی ہیں، یہ بھی ان کا عقیدہ تھا کہ زمین ایسی مسطح ہے جس کی ایک جانب کی انتہا آفتاب نکلنے کی جگہ اور دوسری جانب کی انتہا آفتاب کے غروب کی جگہ ہے، یا مثلاً اگر کوئی شخص سمندر پر چلتا رہے تو وہ زمین کے کنارے پر پہنچ جائے گا، اور اس سے آگے بڑھے گا تو زمین کے نیچے جہنم میں گر جائے گا، جس کے شعلے افق پر غروب شمس کے وقت ظاہر ہوتے ہیں،

(۴) کلیسا کی سیادت۔ حکومت دو حصوں میں منقسم تھی، حکومت دینی اور حکومت دنیاوی، حکومت دینی بالکل کلیسا کے قبضہ میں تھی، اور دنیاوی حکومت امرا اور پوپوں کے درمیان محل نزاع بنی ہوئی تھی، کبھی پوپوں کے قبضہ میں ہوجاتی تھی اور کبھی بادشاہوں کے قبضہ میں، اس میں کلام نہیں کہ کلیسا نے علم و تعلیم، ادب، دینی علوم اور تقیود اجتماعی کے محفوظ رکھنے میں بڑا کام کیا، لیکن اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ کلیسا تفکر و تحقیق کے لیے آہنی دیوار بن گیا، کوئی مفکر اگر اپنے غور و فکر سے

کوئی ایسی بات ظاہر کرتا جو کلیسا کے تعلیم کے خلاف ہوتی، یا ارباب کلیسا کے نزدیک نئی اور انوکھی ہوتی تو جھٹ اس کے کفر و بدعت ہونے کا فتویٰ کلیسا کے دار الافتاء سے صادر ہوجاتا اور وہ مفکر قتل یا سخت سزا کا مستحق قرار پاتا، چنانچہ ازمنۂ وسطیٰ میں بہت سے مفکرین اور علماء اظہار خیال میں جرأت کی وجہ سے قتل کر دیے گئے۔

وہ میدان جن میں مشرق و مغرب کا مقابلہ ہوا

پانچ میدانوں میں ثقافت کے متعلق مشرق کی مڈبھیڑ مغرب سے ہوئی، ان میں سے تین کا تعلق حکومت سے ہے، اس مڈبھیڑ میں مشرق بڑے بڑے عمرانی و سیاسی و نفسیاتی نتائج لیکر نکلا، مغرب نے اس سے حضارت اور ثقافت میں بہترین نتائج حاصل کیے، ان میدانوں کے نتائج حسب ذیل ہیں:۔

اندلس جہاں عربوں کی حکومت آٹھ سو سال رہی، اور انھوں نے اس کو جیسا آباد، آراستہ اور علوم سے معمور کیا وہ اہل خبر سے مخفی نہیں ہے، صقلیہ جہاں صدیوں عربی حکومت و ثقافت رہی، مصری اور شامی سواحل جہاں دو صدی صلیبی لڑائیاں رہیں، شمالی افریقہ میں بھی ثقافت کا مقابلہ رہا، اور قسطنطنیہ کے اطراف میں پندرہویں صدی مسیحی سے پہلے کچھ تھوڑا بہت مقابلہ ہوا،

(۱) اندلسی میدان۔ عربوں نے اندلس کو ۹۲ھ (۷۱۱ء) میں فتح کیا، اور وہاں ایک بڑی سلطنت قائم کی، اور ایک بڑے تمدن کی بنیاد ڈالی، اور جب اندلس میں بنی امیہ کی حکومت کمزور ہوگئی، اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں پیدا ہوکر طوائف الملوکی پھیل گئی، اس زمانہ میں بھی علوم عقلیہ کی روشنی اس تاریک سیاسی افق پر پھیل رہی تھی، اندلس نے مشرق کے علوم کے ماہر علماء اور ان کی کتابیں جمع کیں، اور ان کی رایوں میں موازنہ کیا، تھوڑے ہی زمانہ میں اندلس کے بڑے بڑے شہر مثلاً قرطبہ، اشبیلیہ، ملقا، اور غرناطہ وغیرہ یونیورسٹیوں سے آراستہ ہوگئے، جن میں علوم دینی، ریاضی اور فنون عقلی کا درس دیا جانے لگا، ان یونیورسٹیوں میں صرف اندلسی مسلمان ہی تعلیم نہیں پاتے تھے، بلکہ یورپ کے

یسچی طلبہ بھی اکر علوم کی روشنی حاصل کرتے تھے، ان میں سے ایک فرانسیسی شخص کا نام گربرٹ تھا، جو بعد میں
پوپ سیلفسٹروس ثانی کے نام سے مشہور ہوا (۹۹۹-۱۰۰۳ء) یہ اندلس سے ارقام عربیہ اور علوم عددیہ
(ارتھمیٹک) کا علم حاصل کرکے اپنے وطن واپس گیا، ان ہی میں روبرٹ آف تشستر انگلستانی تھا، وہ
(۱۱۴۱-۱۱۴۷ء) اندلس میں مقیم رہا، اور ۵۴۰ھ (۱۱۴۵ء) میں خوارزمی کی کتاب الجبر، اور
کیمیا اور علم ہیئت کی چند کتابوں کو یورپ لے گیا، اور ہرمانوس دالماتا کی شرکت میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا،
یہ ترجمہ سوئزرلینڈ میں ۱۵۴۳ء میں شائع ہوا، ان ہی لوگوں میں سے ایک ہرمانوس مذکور ہے، وہ اندلس
میں (۱۱۳۸ء-۱۱۴۲ء) مقیم رہا، اور فلکیات کی بعض کتابیں بھی نقل کیں، اس کی تالیفات ایسی ہیں جن میں
عربی اثر پورے طور پر ظاہر ہوتا ہے، ان میں دانیال مورلی انگلستانی بھی ہے (بارہویں صدی عیسوی کے
نصف ثانی میں) وہ اندلس میں مقیم رہا، وہاں اس نے بطلیموس کی کتاب مجسطی حاصل کی اور کتاب الفلسفہ
یا کتاب الطبیعۃ الدنیا والعلیا لکھی جس میں عربی اثر نمایاں ہے خصوصاً ان فصول میں جو فلک سے متعلق ہیں۔
عربی سے لاطینی میں ترجمہ کرنے والوں میں جیرارد قرمونی زیادہ مشہور ہے، وہ طلیطلہ میں (۱۱۳۴ء
۱۱۸۷ء تک) مقیم رہا، اس نے مجسطی، فن کیمیا میں رازی کی کتاب، قانون ابن سینا، خوارزمی کی کتاب
حساب الجبر والمقابلہ، فرغانی کی کتاب المدخل الی علم حیاۃ الافلاک اور کندی کی بہت سی کتابوں
کا ترجمہ کیا، مشہور مترجمین میں ادیلار دوف باث بھی ہے، جو انگریز علماء میں بڑا درجہ رکھتا ہے، یہ ان
لوگوں میں ہے جنھوں نے اسلامی علوم اور اس کے فلسفہ کو انگلینڈ لیجانے کی داغ بیل ڈالی ہے،
اس نے عربی سے مندرجۂ ذیل کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا، ابو معشر فلکی کی چار کتابیں بشرکت یوحنا
اشبیلی، خوارزمی کی زیج اور کتاب الارقام الہندیہ اور ہیئت وحساب کی دوسری کتابوں کا بھی
ترجمہ کیا، مشاہیر ناقلین میں سے میخائل سکوٹ، افلاطون تیفولی، دومینیقوس غندیسالفی
اور ہوغ سانتیلا وغیرہ بھی ہیں۔

(ب) صقلی کا میدان - زیادۃ اللہ بن ابراہیم بن اغلب امیر تونس نے ۲۰۲ھ - ۲۲۴ھ
(۸۱۷ء-۸۳۸ء) میں جزیرہ صقلیہ اور اس کے بعد ایطالیہ کے بعض علاقوں پر قبضہ کیا، یہانتک
کہ پوپ یوحنا ہشتم (۸۷۲ء-۸۸۲ء) متواتر دو سال جزیہ ادا کرنے پر مجبور ہوا، اور اس زمانہ
میں بھی جبکہ نارمنوں نے ایطالیہ کے جنوبی حصہ اور صقلیہ پر (۴۸۵ھ-۱۰۹۲ء) غلبہ حاصل کرلیا
تھا عربی ثقافت اس کے بعد بھی عرصۂ دراز تک وہاں باقی رہی اور روجر ثانی شاہ صقلیہ اور اسکے
بیٹے غلیام کا کابینہ عربی اسلامی طرز کا رہا، حتی کہ لوگوں کو روجر کے مسلمان ہونے کا گمان پیدا ہوگیا،
کیونکہ اس کی معاشرت مسلمانوں کی سی تھی اور وہ باوجود پوپ کے اصرار کے صلیبی جنگ میں شرکت
سے محترز رہا، اسکے ارکین دربار میں مسلمان، عیسائی، یہودی اور یونان وانگلستان کے اہل علم سب
شامل تھے، صقلیہ میں دوبارہ مجسطی اور حکیم بطلیموس کی کتاب المناظر (البصریات) کا عربی سے لاطینی میں
ترجمہ کیا گیا، یہ ترجمہ اوجین بلرمی نے کیا تھا، اگر یہ نہ ہوتا تو یہ کتاب بالکل معدوم ہوجاتی، اسی طرح
کتاب کلیلہ دمنہ کا عربی سے یونانی میں ترجمہ کیا گیا، اسی اثنا میں سالرنو (جنوبی ایطالیہ) میں ایک
درسگاہ طب عربی کی تعلیم کے لیے قائم کی گئی،

(ج) حروب صلیبیہ - صلیبی لڑائیوں کے اثنا میں بعض علمائے مغرب نے حصول علم کے لیے
اور بعض اہل مغرب نے جنگ کے لیے مشرق کا قصد کیا، لیکن پھر جنگ سے الگ ہوکر مختلف اطراف
میں چلے گئے، ان میں ایک اسطفان انطاکی ہے، وہ اصل میں اٹلی کا باشندہ تھا، انطاکیہ میں سکونت
اختیار کرلی تھی، اس نے تقریباً ۱۱۲۷ء میں فن طب میں علی بن عباس مجوسی کی کتاب الملکی کا
ترجمہ کیا، یہ کتاب لاطینی میں طبع ہوگئی ہے، ڈاکٹر فیلپ کی رائے میں یہ کتاب فن طب میں بے نظیر ہے،
اس کو صلیبیوں نے لاطینی میں اس وقت نقل کیا جبکہ وہ سوریہ میں تھے، ان کے علاوہ بنارڈ سیلفسٹر
اور فیلیپ طرابلسی نے بھی اس زمانہ میں عربی سے لاطینی میں ترجمہ کا کام کیا ہے، لیکن ان کے ترجمے کم ہیں

یقین نہیں ہے،

(۵) شمالی افریقہ۔ جس زمانہ میں شمالی افریقہ، اندلس اور صقلیہ کے درمیان فلسفیوں اور عالموں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا، اس زمانہ میں شمالی افریقہ نقل و ترجمہ کا ایک بڑا مرکز بن گیا تھا، ان ناقلین میں ایک لیونارڈو البیزانی تھا جو تقریباً ۱۱۷۰ء میں بمقام بیزا (ایطالیہ) پیدا ہوا، اور اوائل عمر میں ایک زمانہ دراز تک بجایہ (الجزائر) میں مقیم رہا، اور وہیں اس نے علوم حاصل کیے، پھر جب وہ اپنے وطن واپس گیا تو بہت سی کتابیں علم حساب میں تالیف کیں، مثلاً کتاب جداول الاعداد، کتاب الہندسۃ العملیہ، کتاب طریقہ حل الاعمال۔

(۶) قسطنطنیہ مشرق و مغرب کا نقطۂ اتصال تھا، اس کو ترکوں نے ۱۴۵۳ء میں فتح کر لیا تھا، یہاں کے ایک عالم لیو توسکوس نے محمد بن سیرین کی کتاب تعبیر الرؤیا کا ترجمہ یونانی سے لاطینی میں کیا، اس کتاب کا ترجمہ عربی سے یونانی میں پہلے ہو چکا تھا۔

مسلمان عالموں اور فلسفیوں کا اثر

یورپ کے فلسفیوں اور ان کے فلسفہ خصوصاً ریاضیات، فلکیات اور طب پر مسلمان علماء کا اثر بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ میں علوم کی تاریخ بھی مختصر بیان کر دی جائے، علمائے مغرب نے اس موضوع پر بڑی ضخیم کتابیں لکھی ہیں، مگر ہم مختصر طور پر مشہور ترین مسلمان فلسفیوں کے اثر کو بیان کرنے پر قناعت کریں گے۔

۱۔ معتزلہ۔ جب معتزلہ نے دینی عقائد کی بنیاد عقل پر قائم کی اور اصول دین میں بحث و تعلیل کرنے لگے اور ان کے بہت سے خیالات عام مسلمانوں کے عقائد کے خلاف نظر آئے تو اس سے مسلمانوں میں بڑا جوش پیدا ہو گیا، اس کا اثر غیر مسلموں پر بھی پڑا، چنانچہ مشرق کے یہودی اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ معتزلی اثرات نے فلسفۂ یہودیہ کی صورت اختیار کر لی، ان یہودیوں میں جو معتزلہ سے زیادہ متاثر ہوئے، سعدیا بن یوسف یا سعید الفیومی (ت ۹۴۲) ہے، یہ الہیات

خاص طور پر متاثر ہوا، اور عربی میں کتاب الامانات والاعتقادات تالیف کی جس میں معتزلی اثرات نمایاں ہیں،

۲۔ اخوان الصفا۔ اخوان الصفا میں اس زمانہ کے علوم و معارف جمع کیے گئے تھے، ان رسائل کا مشرق میں بڑا اثر ہوا، جب ابو الحکم عمرو بن عبد الرحمٰن کرمانی اندلسی (۴۵۸ھ) ۱۰۶۶ء میں مشرق آیا، تو یہ رسائل ساتھ لے گیا، ان رسائل کا اثر کیمیا پر خاص طور سے ہوا، یہ رسائل عبرانی میں ترجمہ کیے گئے، اس لیے یہود کے فلسفہ پر بھی ان کا اثر ہوا خصوصاً سلیمان بن یحییٰ بن جبیرول (متوفی ۱۰۵۸ء) ملقب با فلاطون الیہود اور اس کے معاصر بہیا بن باکودا کے فلسفہ پر۔

۳۔ الکندی۔ یعقوب بن اسحاق کندی (متوفی تقریباً ۲۶۰ھ۔ ۸۷۳ء) عرب کا بڑا حکیم اور اسلام کے مشہور فلاسفہ میں سے ہے، اس کی اکثر کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ ہوا، اور زمانہ طباعت کے آغاز ہی ۱۵۳۱ء سے اس کی کتابیں طبع ہونے لگیں، اس کا اثر طبعیات اور بصریات پر کافی پڑا، خصوصاً روجر باکیون (ت ۱۲۹۴ء) جو تجربی علوم میں انگلستان کے اکابر میں ہے، اور یورپ میں بارود کی ایجاد اسی کی جانب منسوب ہے، اس سے بہت متاثر ہوا، فیتلو (تقریباً ۱۲۷۰ء) نے بھی اس کا اثر قبول کیا، فیتلو جو جرمن پولش ہے، وہ ریاضیات، طبعیات اور بصریات کا عالم تھا، کندی نے موسیقی کے ایقاع کے متعلق کتاب تالیف کی، حالانکہ یورپ اس کے صدیوں پر ایقاع سے واقف ہوا،

۴۔ رازی اول۔ ابوبکر محمد بن زکریا رازی (ت ۳۱۱ھ۔ ۹۲۳ء) عرب کا جالینوس مسلمان اطبا کا سردار، ازمنۂ وسطیٰ کا بہت بڑا مفکر، نامور طبیب، طبعیات اور کیمیا کا عالم اور مشہور فلسفی تھا، کیمیا پر اس کی تالیف کتاب الاسرار ازمنۂ وسطیٰ میں، بلکہ اس کے بعد بھی علم کیمیا کی بنیادی کتاب مانی گئی ہے، اس کا ترجمہ جیرارد و قرمونی نے کیا، رازی نے طب میں کتاب الحاوی تالیف کی، پھر کتاب المنصوری

کے نام سے اس کا خلاصہ کیا، کتاب الحاوی کا ترجمہ لاطینی میں صقلیہ کے یہودی طبیب فرج بن سلیم نے ۱۲۷۹ء (۶۷۸ھ) میں چارلس اول کی سرپرستی میں کیا، کتاب الحاوی پہلی مرتبہ ۱۴۸۶ء اور پانچویں مرتبہ ۱۵۴۲ء میں چھپی، کتاب المنصوری کا ترجمہ لاطینی میں ۱۵۶۵ء میں اور اس کے بعد یورپ کی دوسری زبانوں میں ہوا، اس کتاب میں چیچک کے متعلق سب سے پہلی تقریر ہے۔

۵۔ الفارابی۔ معلم اول ارسطو کے بعد یہ معلم ثانی کا درجہ رکھتا ہے، اہل یورپ میں ابتک فارابی کے فلسفہ کی بڑی عظمت کیجاتی ہے، اس کی متعدد کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ ہوا، اور وہ پیرس میں ۱۶۳۸ء میں شائع ہوئیں، راجر باکون نے ان کا اثر قبول کیا، چنانچہ وہ اس کا قائل ہے کہ "عقل فعال نفس انسانیہ کا جز نہیں ہے، بلکہ اس سے علحدہ ہے، اور وہ اپنے مادہ میں اس سے مختلف باختلاف جوہری ہے"[1] جو فارابی کا خیال ہے۔ البرٹ کبیر (ت ۱۲۸۰ء) ارسطو کی تعلیمات کے سمجھنے اور سمجھانے میں فارابی اور ابن سینا کے نقش قدم پر گامزن رہا، رونالڈ قرمونی اور ددمینیقوس بھی فلسفہ کی ترتیب میں فارابی سے متاثر ہوئے

۶۔ ابن سینا۔ اس کا لقب معلم ثالث اور شیخ الرئیس ہے (ت ۴۲۸ھ) رازی کے بعد مسلمان اطبا میں اس کا درجہ سب سے بلند ہے، مسلمان فلسفیوں میں اس کا اثر یورپ کے فلسفہ پر ابن رشد کے بعد سب سے زیادہ ہے، لیکن طب میں فلسفہ سے زیادہ اثر پڑا، جو لوگ فارابی سے اثر پذیر ہوئے ان میں سے بیشتر ابن سینا سے بھی متاثر ہوئے، اسکندر ہالی انگلستانی (ت ۱۲۴۵ء) اور توماس یوزکی انگلستانی (ت ۱۲۶۰ء) بھی اس سے متاثر ہوئے جنھوں نے البرٹ کبیر کی الٰہیات میں ارسطو کی شرح بلکہ سینٹ توما کی شرح سے بھی پہلے ابن سینا کے اثر سے ارسطو کی رائے کے موافق لکھا ہے، اور راجر باکون کو جب یہ معلوم ہوا کہ ارسطو نے امور معلومہ میں غلطی کی ہے تو اس پر اس کو اعتماد نہ رہا، اور وہ ارسطو کی رایوں کی توضیح میں زیادہ تر ابن سینا پر اعتماد کرتا تھا۔ از منہ وسطیٰ میں یورپ نے جو بڑے درجے کے فلسفی اور متکلم پیدا کیے وہ البرٹ کبیر

[1] لان العقل الفعال لیس جزءاً من النفس الانسانیة۔ ولکنه مفارق لها تماما و مختلف عنها فی مادته اختلافا جوهریا"

(ت ۱۱۹۳ء ـ ۱۲۸۰ء) اور سینٹ توما الاکوینی (ت ۱۲۲۵ء ـ ۱۲۷۴ء) ہیں، یہ دونوں ابن سینا سے بہت متاثر تھے، البرٹ نے اپنی تصانیف میں ابن سینا کی تقلید کی، چنانچہ اس نے ابن سینا کی طرح ارسطو کے علوم کو ایک مجموعہ میں جمع کردیا، اور جب سینٹ توما نے وجود باری پر پانچ دلیلیں قائم کیں تو تاریخ مسیحیت میں پہلی مرتبہ وہ ان دلائل میں ارسطو کے مسلک پر چلا اور ارسطو کی رایوں کے بیان میں ابن سینا کے اسلوب پر اعتماد کیا، اور ملائکہ کے تشخص کے تعدد اور ان کے غیر مادی ہونے میں ابن سینا کی تقلید کی، متی الاکواسپارٹی متوفی ۱۳۰۲ء اور دیترش الفریبورغی بھی جس کی وفات ۱۳۱۱ء کے کچھ بعد ہوئی ابن سینا کے نظریہ "فیض" سے متاثر ہوئے، اس کا یہ عقیدہ ہے کہ پیدا کرنا صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے، اور نظریہ فیض خلق عالم کے منافی نہیں ہے، اور دیترش نے ابن سینا کے اس قول کی بھی موافقت کی ہے کہ عقل فعال مادہ نفس کے لیے مبدأ سببی ہے اور اس کا تعلق نفس کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسے قلب کا تعلق جسم حیوانی کے ساتھ۔ اس میں وہ سینٹ توما کا مخالف ہے۔

فن طب میں ابن سینا کی کتاب قانون کا ترجمہ جیرارڈ قرمونی نے کیا، ۱۴۷۳ء سے ۱۵۰۰ء تک قانون کا لاطینی ترجمہ پندرہ مرتبہ اور عبری ترجمہ ایک بار چھپا، ایک زمانہ تک قانون شیخ الرئیس کو طب میں کتاب مقدس کا درجہ حاصل رہا، اس کے برابر کسی کتاب سے فائدہ حاصل نہیں کیا گیا۔ عربی زبان اور رومن رسم الخط میں ۱۵۹۳ء میں قانون مع کتاب النجاۃ (تالیف ابن سینا) کے چھپا، کتاب النجاۃ کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ۱۹۰۵ء میں طبع ہوا، ابن سینا کی اکثر کتابوں کا ترجمہ لاطینی اور عبری زبان میں کیا گیا۔

۷۔ ابن الہیثم۔ ابو علی محمد بن الحسن بن الہیثم (ت تقریباً ۴۳۰ھ، ۱۰۳۹ء) فلسفہ طبیعی کا بڑا عالم تھا، اس کی آنکھ کی تشریح اور آنکھ کے متعلق طبی مسائل یورپ میں مسائل ابن الہیثم کے نام سے مشہور ہیں، اس کی تالیف کتاب المناظر میں ایسے نظریے پائے جاتے ہیں جو آج علم جدید کا جزء سمجھے جاتے ہیں، اس کتاب کا ترجمہ لاطینی میں بارہویں صدی عیسوی میں ہوا، راجر باکون اور فتیلو پر اس کا بہت اثر ہے۔

۸۔ المعری۔ حکیم شاعر ابوالعلاء المعری (ت ۴۴۹ھ، ۱۰۵۷ء) کا کلام اگرچہ بہت عام اور مشہور ہے،

گر اس میں فلسفیانہ خیالات خصوصیت کے ساتھ نہیں ہیں، اس کا اصل فلسفہ اس کے "رسالۃ الغفران" میں ہے، جس میں اس نے اپنا جنت اور دوزخ کا ایک خیالی سفر بیان کیا ہے، وہ ان دونوں مقاموں میں بعض ادیبوں اور شاعروں اور عالموں کو دیکھتا ہے، ان سے ناقدانہ اور ظریفانہ گفتگو کرتا ہے، اس رسالہ نے دانتے (ت ۱۳۲۱ء) کے ذہن میں "ڈی وائن کامیڈی" کا خیال پیدا کیا۔

۹- الغزالی۔ غزالیؒ (ت ۵۰۵ھ، ۱۱۱۱ء) نے عامۃ الناس کے عقائد خراب ہوجانے کے خوف سے ان میں فلسفہ کی اشاعت کو ناپسند کیا، اور اس کے ابطال کے درپے ہوئے، اسی لیے حجۃ الاسلام ان کا لقب ہوا، انکی کتابیں خصوصاً احیاء العلوم ۱۱۵۰ء سے پہلے یعنی انکی وفات کے کل چالیس سال بعد ترجمہ کی گئیں، احیاء العلوم کو یہودی اور عیسائی فلسفیوں نے بہت پسند کیا، ابوالفرج بن العبری (ت ۱۲۸۶ء) نے علم اخلاق میں اپنی تالیف الحمامہ میں احیاء سے اقتباس کیا ہے، اس کا اثر بہیا بن یوسف بن باکودا کی عربی کتاب کتاب الہدایہ الی فرائض القلوب میں بھی ظاہر ہے، امام غزالی پر البرت الکبیر، مقدس ٹوما اور ازمنہ وسطیٰ کے بعض متاخرین فلاسفہ نے اعتماد کیا ہے، غزالی کا اثر تین صورتوں میں ظاہر ہوا،

(۱) نفی سببیت۔ غزالی کا عقیدہ ہے کہ تمام امور اللہ کے ارادہ سے پورے ہوتے ہیں، نہ کہ ان اسباب سے جو ہمارے سامنے ہیں، اس مسئلہ میں اہل کلیسا کا ان کا مقلد ہوجانا کوئی عجیب چیز نہیں ہے، اسی کے مشابہ ڈافید ہیوم (ت ۱۷۷۶ء) کا یہ قول ہے کہ سبب اور مسبب کے درمیان صرف تذکرہ کا علاقہ ہے، کوئی حقیقی تعلق نہیں ہے، دو امروں کا یکے بعد دیگرے پایا جانا اس کو مستلزم نہیں ہے کہ ایک امر دوسرے امر کا سبب ہو، غزالی علۃ حقیقی اللہ تعالیٰ کو قرار دیتے ہیں اور ہیوم اس میں نفسیاتی بحث کرتا ہے کہ ہم جب کوئی آواز سنتے ہیں تو حکم لگاتے ہیں کہ اس کا بولنے والا کوئی انسان ہے، کیونکہ ہمیں یاد پڑتا ہے کہ ہم نے کسی انسان سے ایسی ہی آواز سنی ہے، ورنہ آواز اور اس کے بولنے والے میں کوئی ایسا تعلق نہیں ہے جس کا ادراک عقل کرتی ہو۔

(ب) الشک۔ نظریہ معرفت میں شک کا قول غزالی کا کوئی اچھوتا قول نہیں ہے، غزالی سے پہلے

سینٹ آگسٹن (ت ۴۳۰ء) اس کا قائل تھا، اس کی رائے میں انسان کے اندر ظاہری حواس ہیں، پھر ان سے اوپر باطنی حواس، پھر ان سب سے بلند عقل کا درجہ ہے، جو ان کے محسوسات میں حکم لگاتی ہے، لیکن عقل انسانی ایک شے کو اپنے سے کبھی اعلیٰ پاتی ہے، کیونکہ عقل میں تغیر ہوتا رہتا ہے، کبھی وہ مدرک بنتی ہے اور کبھی نہیں، اور کبھی معرفت کی طرف دوڑتی ہے، حالانکہ خود حقیقت غیر متبدل ہے، اس لیے جب تم اپنی طبیعت کو متغیر دیکھو تو اپنے نفس کو نور عقل کے باقی رکھنے والے مصدر کی طرف ترقی دو، کیونکہ کل حقائق کا مصدر وہی غیر متبدل حقیقت ہے جو اللہ ہے، مگر امام غزالی اس مسئلہ میں آگسٹن پر فائق ہیں، کیونکہ آگسٹن عقل میں شک کرتا ہے، پھر بھی عقل ہی سے معرفت چاہتا ہے، اور غزالیؒ عقل میں شک کرتے ہیں، اور یقین کرتے ہیں کہ معرفت اس نور سے حاصل ہوتی ہے، جسے اللہ تعالیٰ قلب میں ڈال دیتا ہے، یہ تعجب کی بات ہے کہ ڈیکارٹ (ت ۱۶۵۰ء) اس دقیق فرق سے بے خبر رہا، جسے غزالی نے نظریہ شک میں ملحوظ رکھا ہے۔

(ج) عقل و فلسفہ کو دین و شریعت کا تابع بنانا، یہ ان اسلامی افکار میں ہے جنکا اثر یورپی افکار میں ظاہر ہوا، سب سے زیادہ روشن ہے، غزالی نے یہ نہیں کیا کہ دین اور فلسفہ میں ہم آہنگی اور توافق پیدا کریں بلکہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ علم، فلسفہ اور عقل، وحی، دین اور شریعت کے خادم ہیں، جس کا اثر ازمنہ وسطیٰ کے فلسفہ میں پوری طرح ظاہر ہے، بالخصوص البرٹ کبیر اور ٹوما کے یہاں، اور ان دونوں نے فلسفہ اسلامیہ اور ابن رشد اور غزالی کا اثر بہت قبول کیا، اور کچھ زمانہ سے اسقف کنٹربری اور ازمنہ وسطیٰ کے فقہا بھی اس کے قائل ہوگئے تھے، فلسفہ کا تعلق دین سے ایسا ہی ہے جیسا خادمہ کا تعلق سیدہ سے ہوتا ہے۔

۱۰- ابن باجہ۔ ابن باجہ نے تقریباً ۳۵ سال کی عمر پائی (ت ۵۳۳ھ۔ ۱۱۳۸ء) اس نے فلسفہ میں ایک نئی روح ڈالی، اور فلسفی فکر کی بنیاد ریاضیات اور طبعیات پر قائم کی، دین اور عقل کے درمیان بحث سے علٰحدگی اختیار کرکے صرف عقل سے کام لیا، موسیٰ الناربونی جس نے تدبیر المتوحد

کا ترجمہ عبرانی زبان میں کیا گیا، اس کے واسطے سے ابن باجہ کا اثر یورپی فکر پر ظاہر ہوا، چنانچہ البرٹ اعظم اور بوتیوس داسیا اس سے متاثر ہوئے جو اس کے قائل ہیں کہ انسان حقائق علمیہ تک پہنچنے ہی سے سعادت حاصل کرتا ہے۔

۱۱- ابن طفیل - ابن طفیل (ت ۵۸۱ھ، ۱۱۸۵ء) ازمنۂ وسطیٰ کا زبردست مفکر ہے، اس کی تالیف رسالہ حی بن یقظان میں ایک فلسفیانہ افسانہ ہے، جس میں انسان کی فطری خلقت لے کر عقل انسانی کے طبعی ترقیوں کے ذریعہ معرفت کے سب سے بڑے مرتبہ پر پہنچ جانے پر بحث کی گئی ہے۔ اس رسالہ کا ترجمہ عبرانی میں کیا گیا، اور پیکوک نے لاطینی میں اس کا ترجمہ کرکے مع عربی اصل کے ۱۶۷۱ء میں طبع کرایا، اس رسالہ کا اثر بلتاسار غراتسیان کے "اندرنیو" (۱۶۵۰ء) اور روسو کی کتاب "امیل" میں نمایاں ہے، سپینوزا بھی اس سے اثر پذیر ہوا، اور لیبنتز نے اسے پسند کیا، روبنسن کروزو کے قصہ مولفہ ۱۷۱۹ء میں بھی اس کا اثر ظاہر ہوا، اور اسی کے اثر سے موسیٰ بن میمون نے فلسفہ اور دینیات میں اور ازمنۂ وسطیٰ کے فلسفیوں نے فلسفہ اور کیتھولک عقائد کے درمیان میں تطبیق کی کوشش کی، اور ابن طفیل کی نشو طبعی اور نظریہ معرفۃ اور تجربی علم کا اثر یورپ کی جدید فکر میں ہوا،

۱۲- ابن رشد - ابن رشد (ت ۵۹۵ھ، ۱۱۹۸ء) کا علمی تاریخ میں بڑا درجہ ہے، وہ ازمنۂ وسطیٰ میں بڑے درجہ کا مفکر ہوا ہے، اس کا فلسفہ قیمتی معلومات کا ذخیرہ ہے، اور اس کے فلسفہ نے فکر انسانی میں ایک جوش پیدا کر دیا، وہ ارسطو کی کتابوں کا محض شارح نہیں تھا، اس کی شرحیں حقیقت میں اس کی ذاتی رایوں کا آئینہ یا قدیم رایوں کی صحیح تفسیریں ہیں، اور ارسطو کا فلسفہ سمجھنے کے لیے واحد وسیلہ ہیں، اسی لیے یہ شرحیں ارسطو کی کتابوں کے ساتھ چھاپی جاتی تھیں، اور اسی لیے ولیم اوکرد (ت ۱۲۳۱ء) نے جو پیرس کا مقنن اور اس مجلس کا رکن تھا، جسے پوپ گریگوری نہم نے ارسطو کی کتابوں کی تصحیح کے لیے قائم کیا تھا، ارسطو کی کتاب "ماوراء الطبیعۃ" اور اس کی ارسطو کی شرح پر

اعتماد کیا تھا، ابن رشد کی کتابوں کا ترجمہ عبرانی اور لاطینی میں کیا گیا، اس کی کتابیں صرف وینس میں پچاس بار سے زیادہ چھاپی گئیں، اور یورپ نے فلسفہ ابن رشد سے پورا فائدہ اٹھایا،

ابن رشد کے متبعین اور اس کے مخالفین

ابن رشد کے فلسفہ نے یورپ کی قوت فکر میں آزادی پیدا کر دی، اور ازمنۂ وسطیٰ کے مفکرین نے ابن رشد کی شروح کو بہت پسند اور اس کی رایوں سے اتفاق کیا، اور یورپ میں ایک مستقل "مسلک رشدیہ" پیدا ہو گیا، اس کے ماننے والے بحث و نظر میں عقل سے کام لینے لگے، وہ محض دینی روایات پر اعتماد نہیں کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے مقابلہ میں ایک جماعت مسلک رشدیہ کے مخالفین کی پیدا ہو گئی، جس کا مقصد دین کی حمایت اور ابن رشد اور ارسطو کی مخالفت تھا، مسلک رشدی کا سربرآوردہ شخص سیغر البرابنسونی تھا، جو پیرس یونیورسٹی میں بڑے درجہ پر فائز تھا، کلیسا نے اسے کالج سے نکال دینے کا حکم صادر کیا، مگر اس سے نہ اس کی رائے میں تبدیلی ہوئی اور نہ امنگ میں کوئی کمی ہوئی، ۱۲۷۱ء اور ۱۲۸۴ء کے درمیان میں اس کو دھوکے سے قتل کر دیا گیا،

سیغر کا خیال ہے کہ البرٹ الکبیر اور قدیس ٹوما نے ارسطو کے فلسفہ کو صورت بگاڑ کر پیش کیا ہے، سیغر قدم عالم کا قائل تھا کہ اللہ سوا موجود واحد کے اور کسی چیز کے خلق پر قادر نہیں ہے، اور بہت سی غیر فانی اور ناگزیر عقول کا وجود ہے، اور عقل انسانی صرف ایک ہے، اور جوہر وجود سے مختلف نہیں ہے اور لہٰذا عقل لغۃ شرع سے مختلف ہے، ابن رشد کے موافقین میں، بوتیوس داسیا بھی ہے جو پیرس کالج میں تھا، اور سیغر کا ہم خیال تھا، برینیہ دی نیغل بھی رشدی تھا، یہ ان دونوں کا ہم عصر تھا، ابن رشد کے پیرووں میں جان جاندون الفرنسی (ت ۱۳۲۸ء) سب سے بڑھا ہوا ہے، اس نے بہت سے مسائل میں ابن رشد کی پیروی کی ہے، چنانچہ وہ قدم عالم اور قدم حرکت کا قائل تھا، اور اس کا عقیدہ تھا کہ ہر ممکن الوجود موجود بالضرورت ہے، اور اس کا منکر تھا کہ اللہ تعالیٰ کل موجودات کا خالق ہے

اور عقل بشری کی وحدت اور اس کے خلود کا عقیدہ رکھتا تھا، اس کے فلسفہ کے بنیادی مسائل حسب ذیل ہیں،

(۱) "وجود کی طبیعی اور مادی تفسیر" جو خلق عالم کے دینی تصور اور مفردات وجود کے ساتھ عنایت الہیہ کے عقیدہ کے خلاف ہے۔

(ب) "ازلیۃ مادہ اور قدم عالم کا عقیدہ" جس سے خلق عالم میں اللہ تعالیٰ کے ارادہ بلکہ خلق عالم کا انکار لازم آتا ہے،

(ج) "عقل بشری کی وحدت اور عقول جزئیہ کے عدم خلود کا عقیدہ" یعنی پوری بشریت میں ایک ہی عقل کارفرما ہے، اور بشر کے جملہ افراد صرف اسی عقل کے مظاہر ہیں، جیسے ایک سیب کی متعدد شکلیں کئی آئینوں میں پائی جاتی ہیں، جب کوئی فرد بشر مرجاتا ہے تو اس میں مظہر عقل معدوم ہوجاتا ہے۔ جس طرح جب کوئی آئینہ ٹوٹ جاتا ہے تو اس سے سیب کی شکل غائب ہوجاتی ہے، کلیسا نے اس رائے کی سختی سے مخالفت کی، کیونکہ اس سے موت کے بعد جزا و سزا کا انکار لازم آتا ہے اور مرنے کے بعد ایک آدمی کے دوسرے سے افضل ہونے اور سعادت کے مراتب کی نفی لازم آتی ہے، جو مذہبی عقیدہ کے خلاف ہے،

(د) "انسان مختلف مقتضیات کی بنا پر اعمال کے صدور پر مجبور ہے" نہ اس کا کرنا اسکے اختیار میں ہے اور نہ کرنا اس کی قدرت میں ہے۔ اس عقیدہ سے انسان کے اپنے ارادہ میں آزاد ہونے کی نفی لازم آتی ہے، حالانکہ اختیار اور ارادہ کی آزادی ہی پر انسان کے اعمال کی جزا و سزا مبنی ہے، اس لیے یہ عقیدہ بھی دینی تصور کے خلاف ہے،

(ہ) "نظریۂ حقیقتین" یعنی دین اور فلسفہ کے درمیان استکمال کا علاقہ ہے، ضرورت کا علاقہ نہیں ہے، کبھی ایک بات جو فلسفہ کے نقطۂ نظر سے صحیح ہوتی ہے، دین کے نقطۂ نظر سے غلط ہوتی ہے، اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے، اس عقیدہ کی رو سے دینی اوامر و نواہی کی کوئی وقعت نہیں رہ جاتی، اور وہ صرف نسبتی رہ جاتے ہیں،

رشدیت پیرس سے باڈوا (اٹلی) منتقل ہوئی، وہاں سولھویں صدی مسیحی کے نصف تک اسکی گرم بازاری رہی، رشدیت کے پیرووں میں کاتیانوس تینافوس (ت ۱۴۶۵ء) تھا، جس نے فلسفہ ابن رشد اور کلیسا کی تعلیمات کے درمیان میں تطبیق کی کوشش کی، لیکن تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں یورپ میں ابن رشد اور ارسطو کے فلسفہ کی سخت مخالفت شروع ہوئی، اس کا بڑا سبب وہ خطرہ تھا جس کا نشانہ دین بن رہا تھا، چنانچہ کلیسا نے ان دونوں کے فلسفوں کو پڑھانے کی ممانعت کردی، اور رشدین پر بھی طرح طرح کی سختیاں کی گئیں، کلیسا کے علما نے رشدین کی رد میں کتابیں لکھیں، جس میں البرٹ الکبیر اور قدیس ٹوماز زیادہ مشہور ہیں، ان دونوں کے بعد کچھ اور لوگ اس کام کے لیے اٹھے، ان میں اغیدوس رومی (چودھویں صدی کے اوائل میں) اور رامون اول (ت ۱۳۱۵ء) قابل ذکر ہیں، مگر ان کی کتابیں محض دینی مناظرانہ تھیں، علمی نہ تھیں۔

۱۲- ابن خلدون - ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ عبدالرحمن بن خلدون (ت ۸۰۸ھ ۱۴۰۶ء) نے یورپ میں علم اور فلسفہ میں اثر پیدا کیا، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ علم الاجتماع اور فلسفہ تاریخ کے علما میں اس نے سب سے پہلے فلسفۂ تاریخ کے قوانین وضع کیے، جس کو اس نے اپنے مقدمہ میں اجمالی یا تفصیلی طور پر ثابت کیا ہے، اور جس سے اہل یورپ صدیوں بعد واقف ہوئے۔

علم اور فلسفہ پر یورپ کا اثر

۱- مسلمانوں نے قدیم فلسفہ، خصوصاً یونانی فلسفہ کو ضائع ہونے سے بچالیا، جب پہلی مرتبہ نصرانیت یونان میں داخل ہوئی تو فلسفہ سے اس کو دین میں ضرر کا خوف پیدا ہوا، اور اس نے اس کی تعلیم کی ممانعت کردی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلسفہ کی کتابیں تہ خانوں میں رکھدی گئیں، یا زمین میں دفن کردی گئیں، جب مامون نے ۲۱۴ھ میں فتح حاصل کی تو اس وقت ان کتابوں میں سے بہت سی ضائع ہوچکی تھیں، اگر مسلمان نہ ہوتے تو قدیم فلسفہ بالکل ضائع ہوجاتا،

۲- مسلمانوں نے یونانی فلسفہ عربی زبان میں ترجمہ کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس کا درس دیا،

اس کی شرح لکھی اور اس کے مشکل مسائل کی تفسیر و توضیح کی، پھر اس میں فکر و نظر کے نئے طریقوں اور
جدید تحقیقات اور نئے قوانین کا اضافہ کیا،

مسلمانوں نے فلسفہ کو ازمنہ قدیمہ سے نئے زمانہ کی طرف پہنچایا، اور اس کو ازمنہ قدیمہ کے معلومات
وتحقیقات کا ماخذ بنا دیا، اور علوم کو نقل کرکے محفوظ کر دینا اس کی ایجاد و اختراع سے کم اہم نہیں ہے،
مسلمانوں نے اس کی پوری کوشش کی کہ علم دنیا میں ہمیشہ باقی رہے، اس لیے وہ زمانہ جس میں وہ
علم کے سردار تھے، علم سے کس طرح خالی رہ سکتا تھا،

(ا) حساب۔ مسلمانوں نے ارقام کو درست کیا، مرکب و بسیط حسابی عملیات کو آسان بنایا،
اور سب سے پہلے انھی نے علامات جذور کو وضع کیا، اور کسر عشری کے لیے فاصلہ کی علامت ایجاد کی
اس کی قدر وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو علم حساب اور الجبرا میں علمائے یونان کے تقصیر مخل سے واقف ہیں،
اور یہ جانتے ہیں کہ ہندسہ کے مقابلہ میں ان دونوں علوم میں ان کو پوری دستگاہ نہ تھی،

(ب) الجبرا۔ عرب ہی جبر کے بنیادی قواعد اور اس کے ابتدائی اصولوں کے موجد ہیں، انھوں نے
جبر کے علامات و اشارات کو منضبط قوانین کی صورت میں مرتب کیا، اور ایسے قوانین و ضوابط سے عدد
کو مستنبط کیا، جس سے لوگ پہلے ناواقف تھے، خوارزمی نے معادلہ کو درجہ ثانیہ سے حل کیا، جیسا کہ ہم لوگ
اب کرتے ہیں، عمر خیام نے معادلہ کو درجہ ثالثہ و رابعہ سے قطع مخروط کے واسطہ سے حل کیا جو معادلات
کے حل میں علمائے ریاضیات کی رسائی اور تحقیق کا انتہائی درجہ ہے، اس نے جبر اور ہندسہ کے درمیان
میں ایک مضبوط علاقہ معلوم کیا، اور ہندسی عملیات کے حل میں جبر کے طریقوں سے اور جبری اعمال
کے حل میں ہندسی طریقوں سے کام لیا اور اس کو یہ کامیابی ہندسی تحلیل کے اصول کے موجد دیکارٹ
سے بہت پہلے ہوئی،

(ج) ہندسہ۔ اگرچہ یونان نے ہندسہ میں کوئی ایسی بات نہیں چھوڑی کہ آیندہ آنے والا اس میں

کچھ اضافہ کر سکے، اسکے باوجود ابو علی محمد بن حسن بن ہیثم نے کتاب اقلیدس کی طرح کی ایک کتاب تالیف کی،
جس کے ہندسی مسائل نئے ہیں اور جو قدما کے علم میں نہیں تھے، عربوں نے ہندسہ کو صحیح طریقہ پر سمجھا،

(د) المثلثات۔ علم مثلثات و انساب کے اکثر مسائل و قوانین عربوں ہی نے معلوم کیے، اور
مثلث کروی میں اضلاع کے جیوب کے تناسب کو ان زوایا کے جیوب سے جو ان کے مقابل ہوں ثابت کیا،
اور اوتار کی جگہ جیب کو استعمال کیا، اور مثلثات کرویہ کی مساحت کو سمجھا، اور انھی نے پہلے پہل زاویہ قائمہ
والے مثلثات کے حل میں قانون خامس کو نکالا، اور سب سے پہلے جیب، راس اور قاطع وغیرہ کے درمیان
تعلق ظاہر کیا اور کرہ کی سطح کے نقوش کے اصول کو سمجھا،

(ہ) علم ہیئت (علم الافلاک) سب سے پہلے مسلمان عربوں نے علم نجوم (جو تشن) کے اوہام پر مبنی ہونے کی وجہ سے
اسکے غلط ہونے کا دعوی کیا، البتہ اس میں جہاں تک ستاروں اور سیاروں کے ان مسائل کا تعلق ہے جو مشاہدہ، رصد
اور تفتیش پر مبنی ہیں، تحقیقات کی پوری کوشش کی، بلکہ اس میں وہ یونان سے بھی سبقت لے گئے، انھوں نے سیاروں کی حرکات
کو انکے افلاک میں معلوم کیا اور سب سے پہلے خط نصف النہار کے درجہ کے طول کی علمی اور قانونی تحقیقات کی اور زمین
کی کرویت اور اسکے محور کے گرد اس کی گردش معلوم کی اور رصد کے نہایت عمدہ اور نئے آلات ایجاد کیے؛ اور گھنٹے
بجانے والی گھڑی بنائی، اور طبیعیات مخصوصاً کیمیا میں تجربہ کا اہتمام کیا جس نے جدید ترقیوں کا راستہ کھول دیا،

(ز) علم طب۔ ازمنہ وسطی میں یورپ میں طب کے نام سے کوئی چیز نہیں تھی، بلکہ دفع مرض کے لیے وہمی
خیالات پر عمل تھا، مثلاً وہ لوگ بخار کے مریض کو خوب مارتے تھے تاکہ اس کا شیطان جس کے اثر سے بخار آیا ہے،
بھاگ جائے، اور اگر ان کے وہم میں یہ شیطان اتنا سرکش ہوتا کہ مریض کے بدن سے اس کے نکلنے کی کوئی امید
نہ ہوتی تو شیطان کو مارنے کے لیے مریض کو بھی مار ڈالتے تھے، اسی زمانہ میں رازی، ابن سینا، ابن ہیثم اور ابن طفیل
نے دنیا میں تشریح کی روشنی پھیلائی، زندہ اور مردہ جسموں کی تشریح کی اور جراحی کے عملیات اور بیہوشی کرنے
کے طریقے استعمال کیے،

۵۔ عربوں نے علمی اصطلاحات ایجاد کیں، جن میں سے بعض اصطلاحوں کا یورپ والوں نے ترجمہ کیا اور بعض کو بجنسہ لے لیا،

۶۔ انھوں نے اہل یورپ کو افلاطونیت جدیدہ سے پھیر کر ارسطاطالیسیت کی راہ پر لگا کر فکر صحیح اور نتیجہ خیز علم کا دروازہ کھولدیا،

۷۔ پہلے اہل یورپ احوال عالم کے متعلق دوسرے اہل فکر کے خیالات کو تقلیدی طریقہ پر بے چون وچرا مان لیتے تھے، عربوں نے انکو ان امور میں بحث ونظر کا طریقہ سکھایا اور ان میں عقلی جوش اور فکر ونظر کی نئی دنیا پیدا کر دی،

۸۔ دنیا میں رواداری پھیلانا بھی عربوں کا کارنامہ ہے۔ یورپ میں سسلی کے عیسائی فرمانروا اس رواداری میں ضرب المثل تھے، کہ انھوں نے اپنے دربار میں یہود ونصاری اور مسلمان تمام مذاہب کے علمائے مفکرین کو جمع کیا تھا، مگر اس سے بہت پہلے اموی اور عباسی خلفا اس کا نمونہ پیش کر چکے تھے، انھوں نے اپنے یہاں یہودی، عیسائی، مجوسی اور صابی وغیرہ بہت سے مذاہب کے علما کو جمع کیا تھا،

۹۔ انھوں نے فلسفہ کا خاص شوق اور ولولہ پیدا کیا، اور حقائق کو جاننے کی کوشش صرف علم وحقایق کے حصول کے لیے کی جس میں کوئی اور غرض شامل نہ تھی، ان کے برخلاف جن لوگوں نے یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا، وہ باوجودیکہ اس کی اجرت میں کتاب کے ہموزن سونا پاتے تھے، پھر بھی ترجمہ میں اتنی غلطیاں کرتے تھے کہ ترجمہ کا کام عیب اور مترجم ہونا معیوب سمجھا جانے لگا۔ یہ واضح ہے کہ یونانی سے ترجمہ کرنے والے عموماً غیر مسلم تھے، لیکن عرب مسلمان تحصیل علم میں مخلص تھے، اسلیے انھوں نے صحیح وغلط اور کھرے کھوٹے میں پورا امتیاز قائم رکھا،

اصحابُ الاعراف

از جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی

اللہ تعالیٰ نے سورۂ اعراف میں اصحاب الجنۃ اور اصحاب النار کے ساتھ ساتھ اصحاب الاعراف کا بھی تذکرہ فرمایا ہے، قرآن مجید کا ایک طالب علم جب اس مقام سے گذرتا ہے تو اس کے ذہن میں کم وبیش اس طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں:۔

(ا) اعراف کیا چیز ہے؟

(ب) اصحاب اعراف کون ہیں؟ اور کس لیے وہاں پر ہوں گے؟

(س) اور اس سے متعلق بعض آیتوں اور فقروں کا کیا مفہوم ہے؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ان تمام آیتوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے جن میں اصحاب اعراف کا ذکر ہے:

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ وَعَلَى الْأَعْرَافِ	اور دونوں کے درمیان ایک پردہ ہوگا اور
رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ	اعراف (پردہ) پر کچھ لوگ ہوں گے جو ہر ایک کو
وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلَامٌ	انکی خصوصیات سے پہچانیں گے، اور جنتیوں کو
عَلَيْكُمْ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ	پکارینگے کہ تم پر سلامتی ہو (ابھی) وہ جنت میں
وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ	داخل نہیں ہوئے ہیں لیکن انکی خواہش کر رہے
أَصْحَابِ النَّارِ قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا	ہونگے، اور جب انکی نگاہیں جہنمیوں کی طرف
مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ وَنَادَى أَصْحَابُ	پھیری جائیں گی تو دہولناک منظر سے گھبرا کر)

الْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَ	بول اٹھیں گے خداوندا! ہمیں ظالموں کے ساتھ
بِسِيمَاهُمْ قَالُوا مَا أَغْنَىٰ عَنكُمْ	(دیکھیو، اور اعراف والے (جہنم کے) کچھ مردوں کو جنھیں
جَمْعُكُمْ وَمَا كُنتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ	انکی خصوصیات سے پہچان رہے ہونگے، پکار کر کہیں گے کہ
أَهَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا	تمھیں تمھارا جمع کرنا اور استکبار کرنا کچھ فائدہ نہ دے سکا
يَنَالُهُمُ اللَّهُ بِرَحْمَةٍ ادْخُلُوا	(اور اللہ تعالیٰ جہنم کے رؤسا اور کبراء سے کہے گا کہ)
الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا	کیا یہی اصحاب اعراف ہیں جنکے بارہ میں تم لوگ (دنیا میں)
أَنتُمْ تَحْزَنُونَ[1]	قسم کھاتے تھے کہ اللہ انھیں اپنی رحمت سے نہیں نوازیگا
....	تو (آج تمھارے مزعومات کے خلاف میں انھیں اجازت
....	دے رہا ہوں کہ) تم (اصحاب اعراف) جنت میں داخل
....	ہوجاؤ، تم پر (آئندہ کا) کوئی خوف اور اندیشہ نہ ہوگا،
....	اور نہ تم (گذشتہ پر) غمگین ہوگے۔

اعراف کیا ہے؟ | عربی زبان میں اعراف کا لفظ عرف کی جمع ہے، جس کا اشتقاق معرفت سے ہے اور عرف اسی وجہ سے ہر بلند و بالا چیز کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ معروف، ممتاز اور نمایاں ہوتی ہے، اسی لیے "عرف الدیک" مرغ کی کلغی کو بھی کہتے ہیں، کیونکہ وہ جسم کے تمام حصوں سے اوپر ہوتی ہے، اسی طرح ٹیلہ یا اونچی جگہ کو بھی عرف کہتے ہیں، شماخ بن ضرار نے ایک شعر میں اس لفظ کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے[2]؛

وظلت باعراف تعالی کانہا ... رماح نحاھا وجھۃ الریح راکز

رہا یہ سوال کہ مذکورہ بالا آیت میں اعراف سے کیا مراد ہے؟ تو اس باب میں ہمارے علماء

۱؎ اس آیت کا مفہوم ہمارے نزدیک عام مفسرین سے مختلف ہے جیسا کہ ترجمہ ہی سے واضح ہوگیا اور بعد میں اسکی مزید توضیح کیجائیگی،
۲؎ لسان العرب ج ۱۰

کے متعدد اقوال ہیں۔

(۱) اعراف سے نفس حجاب مراد ہے، جو جنت اور دوزخ کے درمیان حائل ہوگا اور اسی کو سورۂ حدید میں سور (فصیل) سے تعبیر کیا گیا ہے، فَضُرِبَ بَيْنَهُم بِسُورٍ لَّهُ بَابٌ

(۲) سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان پہاڑ ہوں گے جن کی چوٹیوں پر اصحاب اعراف ہوں گے،

(۳) بعضوں کا خیال ہے کہ اعراف سے ٹیلے مراد ہیں،

(۴) بعضوں کے نزدیک اعراف اور پل صراط ایک ہی چیز ہے،

(۵) بعض کہتے ہیں کہ قیامت میں جبل احد جنت و دوزخ کے درمیان حائل ہوگا[1]،

لیکن ہمارے خیال میں وہی قول راجح ہے یعنی جنت و دوزخ کے درمیان حجاب یا سور (فصیل) ہوگی جس کے اوپر یہ لوگ روک دیے جائیں گے،

اس حجاب یا اعراف کا سبب قاضی بیضاوی کے نزدیک یہ ہے:

لمنع وصول اثر احدھما الی الاخری[2] ... تاکہ ایک کا اثر دوسرے تک نہ پہنچے

لیکن حضرت شاہ عبد القادر صاحب فرماتے ہیں:۔

"اور درمیان بہشتیوں اور دوزخیوں کے پردہ حائل ہوگا یا دیوار ہوگی تاکہ باہر نہ نکل سکیں اور اسی کو اعراف کہتے ہیں[3]"

یہ صرف تعبیر بیان کا فرق ہے ورنہ بات دونوں حضرات کی یکساں ہی ہے،

اعراف کے لفظ سے تعبیر کی علت اوپر واضح کیجا چکی ہے، مگر بعض علماء کا خیال ہے کہ اعراف اس مقام کا نام اس لیے ہوگا کہ وہاں کے لوگ جنتیوں اور دوزخیوں کو پہچانتے ہوں گے، جیسا کہ ابن جریر

۱؎ تفصیل کے لیے تفسیر ابن جریر اور ابن کثیر دیکھنا چاہیے ۲؎ بیضاوی شریف ۳؎ موضح القرآن

نے سدی سے اس کی روایت کی ہے، اور حضرت شاہ عبد القادر صاحب بھی فرماتے ہیں :

"اور اس مقام کا نام اعراف اس واسطے ہے کہ مرد وہاں کے پہچانیں گے۔"

اصحاب اعراف کون ہیں رہی اس امر کی تعیین کہ اصحاب اعراف کون لوگ ہوں گے، اس سلسلہ میں سب سے پہلے اساطین تفاسیر کے اقوال و آراء بیان کر دینا مناسب ہوگا، حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ اس بارہ میں علماء کے تیرہ اقوال ہیں لیکن تمام اقوال کا ذکر باعث طوالت ہوگا، اور بعض اقوال نہایت رکیک معلوم ہوتے ہیں، اس لیے صرف مشہور اقوال کے ذکر پر ہم اکتفا کرتے ہیں،

(۱) سب سے زیادہ عام اور مشہور قول تو یہ ہے کہ اعراف پر وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی یعنی نہ تو نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا کہ جنت میں چلے جائیں اور نہ برائیوں کا ترازو وزنی ہوگا کہ دوزخ میں ڈالے جائیں، جیسا کہ خود کلام مجید میں فرمایا گیا ہے:

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ	جن کی میزان بھاری ہوگی وہی کامیاب ہونگے
هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ	لیکن جن کی ہلکی ہوگی تو یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے
فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ	اپنے آپ کو گھاٹا دیا۔

اس لیے ان لوگوں کو اعراف پر روک دیا جائے گا تا آنکہ اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم سے انھیں جنت میں داخل کر دے، یہ رائے سلف میں عبد اللہ بن مسعود، حذیفہ، ابن عباس، شعبی، ضحاک اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم کی ہے۔

(۲) کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اعراف پر وہ لوگ روکے جائیں گے جو اپنے والدین کی مرضی کے خلاف جہاد میں شریک ہوئے تھے لیکن شہید ہوگئے،

(۳) مشہور تابعی مفسر مجاہد کے نزدیک اصحاب اعراف نیکوکار علماء اور فقہا ہوں گے،

(۴) شرجیل اور قشیری فرماتے ہیں کہ یہ شہداء ہوں گے،

(۵) عبد اللہ بن عباسؓ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ انبیاء ہونگے، زجاج کی بھی یہی منقول ہے،

(۶) ابو مجلز کے نزدیک یہ ملائکہ ہیں،

علامہ ابن جریرؒ نے ان اقوال میں سے کسی ایک کی تائید نہیں فرمائی ہے، بلکہ سب کی صحت کا فیصلہ فرمایا ہے، البتہ ابو مجلز کے قول کی تردید کی ہے،

علامہ ابن کثیر کا فیصلہ حافظ ابن کثیرؒ ان مختلف اقوال کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں :-

وفي هذه الاقوال ما يدل على ان اصحاب	ان اقوال میں بعض سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ
الاعراف دون اهل الجنة في	اصحاب اعراف اہل جنت سے کمتر درجہ کے ہونگے،
الدرجات وان كانوا يدخلون	اگرچہ وہ بھی اللہ کی رحمت سے جنت میں چلے جائیں گے،
الجنة برحمة الله تعالى وفيها	اور بعض سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل جنت سے اعلیٰ درجہ
ما يدل انهم افضل من اهل	کے ہوں گے اور اس بارہ میں کوئی واضح نص
الجنة واعلى منهم منزلة	اور روشن دلیل نہیں ہے جس کی بنا پر قطعی
وليس في الباب ما يقطع به من	فیصلہ کیا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
نص جلي وبرهان منير	

حافظ صاحب کی رائے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس بارہ میں کوئی ایسی قابل اعتماد نص اور اساسی چیز نہیں ہے، جس کی بنیاد پر سلف کے کسی قول کو اختیار کرنا ہر شخص کے لیے ضروری ہو، تمام کتب تفاسیر کو دیکھنے سے کم و بیش اسی طرح کے اقوال ملتے ہیں، مگر اس کو تسلیم کرنے کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی مرفوع اور صحیح حدیث اس بارہ میں مروی نہیں ہے، مفسرین کسی نہ کسی قول کو اختیار کر لیتے ہیں،[۲] حالانکہ اس پر ضعیف حدیثوں کے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں،

---

[۱] یہ تمام اقوال ابن جریر، ابن کثیر اور امام رازی کی تفاسیر سے نقل کیے گئے ہیں [۲] اور بالعموم متاخرین نے تو اسی مشہور قول کو اختیار کیا ہے،

اس لیے اس کی تاویل کی دو ہی صورتیں ہیں یا ان ہی اقوال میں سے کسی قول کو اختیار کر لیا جائے خواہ اس پر پورا اطمینان نہ ہو یا فکر و نظر سے کام لیکر کوئی اور انسب راہ اختیار کیجائے. اس جدید راہ کو اختیار کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پوری فکر و کاوش کے ساتھ قرآن مجید، احادیث نبوی اور اصول شریعت کو پورے طور سے ملحوظ رکھکر قدم اٹھایا جائے، اور اس کا مقصود محض نکتہ آفرینی نہ ہو بلکہ تحقیق حق ہو

ہماری رائے اعراف کے متعلق ہمارا نقطۂ نظر اوپر گذر چکا ہے. یہاں اصحاب اعراف کی تعیین کرنی ہے، مگر اس سلسلہ میں ہمارا نقطۂ نظر جدید و قدیم تمام مفسرین سے کسی قدر مختلف ہے،

ہمارے خیال میں اصحاب اعراف بڑے کامل الایمان لوگ ہوں گے، ان کا ایمان پختہ اور ان کے عقائد غیر متزلزل تھے بڑے خستہ حال لوگ تھے، غربت، افلاس، بیچارگی، مظلومی، تنگی اور عسرت کے دور سے گذر رہے تھے، معاشی اور اقتصادی حیثیت سے نہایت پست، اور خاندانی اعتبار سے بھی اونچے طبقے کے لوگ نہ تھے، اسی لیے جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو اس راہ میں ان کو طرح طرح کی مشقتیں اور زحمتیں برداشت کرنا پڑیں، وہ کفار و مشرکین کا تختۂ مشق بنے ہوئے تھے، کفار و مشرکین ان کی حالتِ زار دیکھکر کہا کرتے تھے کہ ہم خوشحالوں کے بجائے کیا اللہ تعالیٰ ان ہی بدحالوں کو حیات سرمدی اور جنت سے سرفراز کرے گا، قرآن مجید نے مشرکین کے اس استحالہ کا متعدد مقامات پر تذکرہ فرمایا ہے، یہ لوگ انبیا علیہم السلام کی دعوت حق قبول کرنے سے صرف اس لیے گریز کرتے تھے کہ اس دعوت کے ماننے والے کمزور اور پست طبقہ کے لوگ تھے، چنانچہ فرمایا:

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَا نَرٰكَ	(حضرت نوحؑ کے پیام حق کے جواب میں انکی قوم)
اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰكَ اتَّبَعَكَ	کافر سرداروں نے کہا ہم تو تمھیں اپنے ہی جیسا
اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ	آدمی سمجھتے ہیں، اور ہم تو دیکھتے ہیں کہ تمھاری پیروی

وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ	ہمارے اندر سے صرف رذیل اور سطحی نظر کے لوگوں نے
بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ	کیا ہے، اور ہم اپنے اوپر تمھاری کوئی برتری بھی نہیں
(ھود)	دیکھ رہے ہیں، بلکہ تمھیں جھوٹا سمجھ رہے ہیں،

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا:

انؤمن لک واتبعک الارذلون	کیا ہم تمھاری تصدیق کرلیں دراں حالیکہ
(شعراء)	تمھاری اتباع پست لوگوں نے کی ہے

اور یہ واقعہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت پر سب سے پہلے ضعفاء اور مفلوک الحال لوگوں نے لبیک کہا ہے، اور بڑے اور صاحب وجاہت لوگ ہمیشہ مال و دولت کے گھمنڈ میں مبتلا رہے ہیں، اس کی ایک مثال ہرقل اور ابوسفیان کی اس گفتگو میں ملتی ہے جو ہرقل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کی تحقیقات کے سلسلہ میں کی تھی، اور اس سلسلہ میں ہرقل نے ایک سوال یہ بھی کیا تھا کہ آپکے پیرو کون لوگ ہیں، شرفاء اور اصحاب وجاہت ہیں یا غریب اور نیچے طبقہ کے لوگ، ابوسفیان نے جواب دیا تھا، غریب اور نیچے لوگ، یہ سنکر ہرقل نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ انبیاء کی پیروی غریب اور کمزور ہی لوگ کرتے ہیں[1]،

اتنا ہی نہیں بلکہ رؤساء اور کبراء یہ بھی کہتے تھے کہ کیا سوسائٹی کے کمزور اور پست طبقہ کے لوگوں کو جنت مل جائے گی، ہم تو سمجھتے ہیں کہ جنت کا وعدہ پروپگنڈہ ہے، اولاً تو جنت و دوزخ کا معاملہ ہی نہیں پیش آئیگا، اور بفرض محال اگر پیش بھی آیا تو ہمیں (رؤساء اور کبراء) وہاں بھی بلند و برتر رہینگے،

وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنْ	اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت
رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا	ہوگی، اور اگر مجھے میرے رب کے پاس لوٹنا ہوگا تو

[1] بخاری شریف جلد اول باب الوحی

مِنْهَا مُنْقَلَبًا	تو وہاں بھی اس سے بہتر ٹھکانا پاؤں گا۔

اس لیے ہماری رائے یہ ہے کہ یہی کمزور اور پست لوگ جو نہایت کامل الایمان تھے، اعراف پر کھڑے کیے جائیں گے، تاکہ مال و جاہ کے متوالے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلیں کہ ان کا خیال کتنا خام تھا، اور انھوں نے ان مظلومین کے بارہ میں جو تصور قائم کیا تھا، اور اپنے متعلق جس فریب میں مبتلا تھے، وہ کتنا غلط تھا، اسی لیے بعد میں فرمایا گیا:

اَھٰؤُلَاءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمْتُمْ	کیا یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم قسم کھاتے تھے
لَا یَنَالُھُمُ اللّٰہُ بِرَحْمَۃٍ	کہ اللہ انھیں اپنی رحمت سے نہ سرفراز کریگا،
اُدْخُلُوا الْجَنَّۃَ لَا خَوْفٌ	سو اب تم لوگ جنت میں داخل ہوجاؤ، تم پر
عَلَیْکُمْ وَلَا اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ	کوئی خوف وحزن نہ ہوگا،

ہمارے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے، اور "ھٰؤلاء" کا اشارہ اصحاب اعراف کیجانب ہے اور یہ خطاب اصحاب نار ہی سے خصوصیت کے ساتھ ان کبرا اور سادات سے ہے جو دنیا میں ضعیف اور کمزور طبقہ کے اہل ایمان کے متعلق قسم کھایا کرتے تھے، کہ بھلا یہ لوگ بھی کیا جنت میں جاسکیں گے،

بعض علمائے تفسیر کی رائے بھی یہی ہے، چنانچہ صاحب درمنثور لکھتے ہیں:

قال اللّٰہ لاھل التکبر اَھٰؤُلَاءِ	اللہ متکبرین سے کہے گا کہ کیا ان ہی لوگوں کے
الَّذِیْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا یَنَالُھُمُ اللّٰہُ	متعلق تم قسم کھاتے تھے کہ اللہ ان پر اپنی رحمت نہ
بِرَحْمَۃٍ	کرے گا۔

بیضاوی نے "قیل" کہکر ایک اور قول نقل کیا ہے، جس سے اگرچہ ہماری تائید نہیں ہوتی، مگر اس کی تردید بھی نہیں ہوتی:

وقیل لما عیروا اصحاب النار	اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب اصحاب اعراف اصحاب نار کو

اقسموا ان اصحاب الاعراف لا	عار دلائیں گے تو وہ قسم کھائیں گے کہ اصحاب اعراف
یدخلون الجنۃ فقال اللّٰہ	جنت میں داخل نہ ہونگے، بس اللہ تعالیٰ یا
او بعض الملٰئکۃ اَھٰؤُلَاءِ الَّذِیْنَ	کوئی فرشتہ کہے گا کہ کیا یہی لوگ ہیں جن کے
اَقْسَمْتُمْ الخ	بارے میں تم قسم کھاتے تھے۔

ایک حد تک ہمارے مسلک کی تائید مفسرین کے عام خیال سے بھی ہوتی ہے کہ اَھٰؤُلَاءِ الَّذِیْنَ الخ اصحاب اعراف کا اصحاب نار سے خطاب ہوگا اور ھٰؤلاء کا اشارہ ضعفائے جنت کی طرف ہے، کیونکہ جہنم میں جانے والے ارباب ثروت کفار دنیا میں ضعفائے مومنین کے متعلق قسم کھاکر کہا کرتے تھے کہ یہ جنت میں نہ جائیں گے، چنانچہ اردو تفسیروں میں حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے اس خیال کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان فرمایا ہے:

"اور پکاریں گے اعراف والے مردوں کو دوزخ والوں سے کہ پہچانیں گے ان کو ساتھ نشانیوں ان کے کہ منہ کالے ہوں گے اور نیلی آنکھیں، اور وہ مرد سردار کافروں کے ہونگے جیسے ولید بن مغیرہ، ابوجہل، عاص بن وائل اور مانند ان کے مشرکوں سے کہ دنیا میں کہتے تھے کہ یہ ہرگز نہ ہوگا کہ خدا بلال، عمار، اور صہیب کو بہشت میں لیجاوے اور ہم کو دوزخ میں اور قسم کھاتے تھے کہ غلاموں اور چرواہوں کو اوپر ہمارے بزرگی نہ ہوگی۔"

یہ صرف شاہ صاحب کا خیال نہیں بلکہ جمہور مفسرین کی انھوں نے ترجمانی فرمائی ہے، لیکن اس تاویل پر متعدد شکوک و شبہات وارد ہوتے ہیں اور ہم نے جو تاویل اختیار کی ہے اور جس کی تائید بعض اور مفسرین کے قول سے بھی ہوتی ہے وہ زیادہ دلنشین ہے۔

اس تاویل کو اختیار کرنے کے وجوہ اگرچہ یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ یہ تاویل کیوں اختیار کی گئی، اس لیے کہ خود علمائے سلف کے اس سلسلہ میں بکثرت اقوال موجود ہیں، اور ان کا ان میں سے کسی ایک تاویل پر

اجماع نہیں ہوا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں خود کسی رائے پر پورا اطمینان نہیں ہے، حافظ ابن جریر اور ابن کثیر کی تصریحات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی مرفوع حدیث بھی اس بارہ میں وارد نہیں ہے، مگر ان باتوں سے قطع نظر کرکے بھی ہم اپنے دعوی کے ثبوت میں چند دلائل پیش کرتے ہیں،

(۱) امام رازی صاحب نے تمام اقوال سلف کو دو قولوں کے اندر محدود کردیا ہے (۱) اہل طاعت و ثواب میں سے اشراف لوگ اعراف پر ہوں گے، (۲) اہل ثواب میں سے کمتر درجہ کے لوگ، جن کے اعمال حسنہ اور سیئہ برابر برابر ہوں گے،

اگر غور سے دیکھا جائے تو یہاں انھیں دو باتوں کا واقعی احتمال بھی پیدا ہوتا ہے، مگر پہلا احتمال چند وجوہ سے قابل قبول نہیں ہے،

(۱) حدیثوں سے نہایت صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک طرف لوگ اپنے اچھے اعمال کی وجہ سے جنت میں جائیں گے تو دوسری طرف برے اعمال کا ارتکاب کرنے والے بھی اپنی سزا بھگت کر جنت میں داخل کیے جائیں گے، اور بہت سے گنہگار محض اللہ تعالی کے رحم وکرم سے جنت میں چلے جائیں گے، بعض لوگ جن کی ساری زندگی معصیت میں بسر ہوئی ہے لیکن ان کا ایک عمل خیر ساری برائیوں پر بھاری ہوگا، ایسی حالت میں اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان لوگوں پر اللہ تعالی کی رحمت نہیں ہوسکتی جن کے اچھے اور برے اعمال برابر ہیں، جہاں وہ بڑے بڑے گنہگاروں کو بچالے گا وہاں ان لوگوں کو بھی بچا سکتا ہے، اور یہ محض قیاس نہیں ہے بلکہ تمام لوگوں کے نزدیک یہ مسلم ہے اللہ کی رحمت اس کے عذاب اور نقمت پر غالب ہے، اس لیے جب ان کے اچھے اور برے اعمال کا معاملہ برابر ہے تو اللہ تعالی کی رحمت کا تقاضا ہے کہ انھیں جنت میں داخل کردے،

(۲) اعراف پر روکنے کی خاص حکمت کیا ہوسکتی ہے، یہ بالکل ظاہر ہے کہ اعراف یا بلند مقام پر پہنچنا

عزت و برتری کی علامت ہے، اور یہ معلوم ہے کہ اصحاب اعراف اللہ کی نظر میں معزز اور مکرم نہیں ہیں کیونکہ ان کے اچھے اور برے اعمال یکساں ہیں،

(۳) قرآن مجید نیز کسی صحیح روایت سے بھی اس خیال کی تائید نہیں ہوتی،

(۲) دوسرا احتمال وہ بظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے، مگر اس سلسلہ میں جو اقوال بیان کیے گئے ہیں وہ کسی طرح درست نہیں معلوم ہوتے، پورے غور وفکر کے بعد ہم نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اس سے وہ خستہ حال مومنین مراد ہیں جنھوں نے ایمان واسلام قبول کرکے کفار ومشرکین کے ہاتھوں طرح طرح کی زحمت اور مشقت برداشت کی تھی، اور جن کے بارہ میں مشرکین بطور استہزا کہا کرتے تھے کہ یہ ارذال اور اجلاف کیا جنت میں جائیں گے، اس لیے انھیں مقام اعراف پر روک دیا جائے گا، تاکہ مال ودولت پر گھمنڈ کرنے والوں کو یہ اچھی طرح یقین ہوجائے کہ ان کا معیار عزت وذلت کتنا غلط تھا ۔

خاکسارانِ جہاں را بنظر حقارت منگر تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

اس سے اگر ایک طرف اشراف وصاحب وجاہت لوگوں کی انتہائی رسوائی ہوگی تو دوسری طرف مظلومین اور ضعفاء کی دلدہی بھی ہوگی، ایک کے مزعومات کی تردید ہوگی، اور دوسرے کی تمنا بر روے کار آئے گی،

(۲) اسی سلسلہ بیان کے اس ٹکڑے سے "ما اغنی عنکم جمعکم وما کنتم تستکبرون" تو ہماری تاویل کے علاوہ کسی دوسری تاویل کی گنجائش ہی نہیں رہتی، یہ کتنا لطیف اور زبردست طنز ہے کہ ایک دن یہ لوگ مال ودولت کے نشہ میں چور ہوکر ان غریب اور فاقہ مست لوگوں پر پھبتیاں کس رہے تھے، اور اب ان ہی غریبوں کو یہ کہنے کا موقع مل رہا ہے کہ تم جو مال ودولت کی کثرت پر پھولے نہیں سماتے تھے تو کیا اب تمھارا مال ودولت تمھارے کچھ بھی کام آیا، اور ہماری غریبی اب جاکر رنگ لائی،

یہ تو مسلم ہے کہ اصحابِ اعراف کا اصحاب نار سے خطاب ہے، اور جو لوگ کلام کی بلاغتوں اور خوبیوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، وہ ہماری تاویل کی پوری تائید کریں گے،

(۳) اھؤلاء الذین اقسمتم الخ سے بھی ہماری تائید ہوتی ہے، اور اس آیت کا مفہوم پورے حسن و خوبی کے ساتھ اسی وقت بے نقاب ہوتا ہے جب ہماری تاویل کو اختیار کیا جائے۔

(۴) اور مطلقاً جو کہا جاتا ہے کہ اصحاب اعراف اصحاب نار کو عار دلائیں گے تو ابھی انھیں یہ کہنے کا موقع کہاں ہے، ابھی تک ان پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم نہیں ہوا ہے اور ان کی بے چینی اور پریشانی دور نہیں ہوئی ہے، یہ تو وہی کہہ سکتا ہے جو کبھی خود اصحاب نار کا طنز و طعنہ سن چکا ہو، یا اللہ تعالیٰ کہے،

(۵) سورۂ اعراف کے موقعہ نزول اور انداز بیان سے بھی ہماری تائید ہوتی ہے، کیونکہ یہ مکی سورہ ہے، جب کفار و مشرکین دعوت نبوی کی پوری شدت کے ساتھ مخالفت کر رہے تھے، اور غریب اور مفلوک الحال مسلمانوں کو اسی قسم کا طعنہ دے رہے تھے جس قسم کے طعن و طنز کا اوپر ذکر ہو چکا ہے،

لم یدخلوھا وھم یطمعون کی تاویل

اس پورے سلسلۂ بیان میں جو وقت طلب آیتیں تھیں، ان کا مفہوم واضح ہو چکا ہے، لیکن یہ فقرہ تشریح اور توضیح کا طالب ہے، کیونکہ اس سے بعض لوگوں نے اپنے خیال کی تائید اور دوسرے گروہ کی تردید کی ہے کہ اگر اصحاب اعراف سے اشراف اور معزز لوگوں کو مراد لیا جائے تو یہ وصف یعنی طمع ان کے شایان شان نہیں ہے، اسی لیے لوگوں کو بڑی دقتیں پیش آئی ہیں، اور بعضوں کو یہ ثابت کرنا پڑا ہے کہ طمع کے معنی یقین کرنا ہے[1]، حالانکہ کسی لفظ کو اس کے معروف اور مشہور معنی سے ہٹا کر غریب اور نادر معنی میں استعمال کرنا کسی طرح درست نہیں ہے، اگر یہ مان لیا جائے کہ اصحاب اعراف بھی جنت کی خواہش و طمع کریں گے تو ہمارے نزدیک

[1] دیکھو تفسیر کبیر للرازی۔

اس میں کوئی دشواری نہیں، اس لیے کہ جنت کی طمع تو ہر مومن کے اندر اس وقت تک رہے گی جب تک وہ جنت میں داخل نہ ہو جائے گا، اور پھر یہ لوگ جن کے سامنے عیش و عشرت کے تمام سامان موجود ہیں اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں مصلحتاً روک رکھا ہے، اور انھیں قطعی طور پر یہ معلوم بھی ہے کہ وہ جنت میں جائیں گے، بھلا کس طرح اپنے بے پایاں جذبۂ شوق کو قابو میں رکھ سکیں گے، یہ تو مسلّمہ اصول ہے،

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک — آتشِ شوق تیز تر گردد

اس لیے اگر خدا کی راہ میں ہر طرح کے ظلم و ستم انگیز کرنے والے اس کے حکم سے اگر تھوڑی دیر کے لیے اعراف پر روک کے جاتے ہیں اور جنت کا دلکش منظر دیکھ کر جنت میں جانے کے لیے بے چین اور مضطرب ہوں تو اس میں کونسا اشکال ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں فطرت کی صحیح تصویر کشی کی گئی ہے، اور قرآن مجید نے جو انتہائی حقیقت افروز بات فرمائی ہے، اسی میں لوگوں کو برائی نظر آرہی ہے، اور ایسی ایسی توجیہات کی ہیں، جس سے آیت کا سارا حسن و جمال غارت ہو جاتا ہے، اور اس کی ساری لطافت اور خوبی پر پانی پھر جاتا ہے،

اس لیے اس آیت کا سیدھا سادا مفہوم یہ ہے کہ اصحاب اعراف ابھی جنت میں داخل نہ ہوئے ہوں گے، لیکن ان میں جنت کے داخلہ کا بے پایاں جذبۂ شوق ...... موجزن ہوگا، اور اس مفہوم میں ہم کو کوئی زحمت نہیں نظر آتی ہے۔

مثنوی برہان رازالٰہیؒ

ازجناب شیخ فرید ایم اے، لکچرار رابرٹسن کالج جبلپور

شیخ برہان الدین رازِ الٰہیؒ[1] المتوفی ۱۰۸۳ھ سلسلۂ شطاریہ کے جید عالم اور صوفی بزرگ تھے، انھوں نے یگانۂ عصر، محدثِ کامل حضرت شیخ علم اللہ کمالؒ کی خدمت میں فقہ، حدیث اور سلوک کی تحصیل کی، علوم ظاہری کی تحصیل کے بعد علوم باطنی کے شوق میں ایک عرصہ تک حسن بنبانی کی خدمت میں رہے اور آخر میں حضرت عین العرفا مسیح الاولیاء شاہ عیسیٰ جند اللہؒ کے ہاتھ پر بیعت کی،

حضرت رازِ الٰہیؒ عابد مرتاض تھے، شب و روز عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔

ایک عرصہ کی ریاضتِ شاقہ کے بعد حضرت شاہ مسیح الاولیانے ان کو خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا،

اورنگ زیب عالمگیر، عاقل خاں رازی اور امیر شایستہ خاں کو حضرت مسیح الاولیاسے بڑی عقیدت تھی، چنانچہ جانشینی کی جنگ میں آتے وقت شہزادہ اورنگ زیب نے شیخ نظام برہانپوری کی معیت میں ان کی خدمت میں حاضر ہو کر باطنی توجہ کی درخواست کی تھی۔

ایک عرصہ تک زمانہ ان کے باطنی فیض سے مستفیض ہوتا رہا، ۱۰۸۳ھ میں ان کا وصال ہوا۔

حضرت رازِ الٰہی کو علوم متداولہ خصوصاً حدیث و فقہ میں کامل دستگاہ حاصل تھی، نثر میں "شرح آمنت باللہ"، "وصیت نامہ" اور "شرح ہیم کہانے" ان کی یادگار ہیں[2]،

---

[1] تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ کیجئے معارف نمبر ۵-۶ جلد ۶۰، [2] بزم تیموریہ ص ۲۵۲-۲۵۳ کتبخانۂ خانقاہ رازِ الٰہی میں ان کتابوں کے قلمی نسخے محفوظ ہیں، موجودہ سجادہ نشین حضرت سید حبیب الدین صاحب نے از رہِ بندہ نوازی اور علم دوستی مذکورہ بالا مخطوطات مرحمت فرمائے تھے۔

اول الذکر آمنت باللہ کی عام فہم تشریح ہے، وصیت نامہ اوراد و اشغال پر مشتمل ایک مختصر رسالہ ہے جس میں طالبان عشق کیلیے مختلف وصیتیں کیگئی ہیں، اس میں "ہو الاول ہو الآخر ہو الظاہر ہو الباطن" کی تشریح بھی ہے،

"شرح ہیم کہانے" ہندی دوہروں کی فارسی شرح ہے،

حضرت برہان الدین رازِ الٰہی کو شعر و سخن سے بھی ذوق تھا، لیکن زیر نظر مثنوی و مناجات اور چند متفرق اشعار کے علاوہ آپ کا زیادہ کلام نہیں مل سکا،

وصیت نامہ کے آخر میں حسب ذیل مناجات مرقوم ہے، جس کے صرف تین شعر (پہلا، دوسرا اور گیارھواں) شرح آمنت باللہ کے آخر میں مندرج ہیں۔

یارب مرا گرداں چناں، از راہ لطف و مرحمت　　بے شک شمارم اغنیا، شاہاں نیارم در نظر

باشم توانگردل چناں، از کس نخواہم حاجتے　　فارغ نشینم شاد و خوش، بیروں نیایم پیش در

راضی بہ فقر و فاقہ ہم باشم بہ کنج اندروں　　ممنون زمنتِ سفلگاں مارا مگرداں تاحشر

از بہر روزی رزق ہم وقتے پریشاں دل مکن　　یارب بدہ صبرم چناں، جز تو نخواہم کس دگر

یارب بحق مصطفےٰ، ہم انبیاء، ہم اولیاء　　گرداں چناں ایں تحفہ را مقبول گردد بحر و بر

عاشق بود جملہ جہاں، اندر درونِ جانِ خود　　سازند پاکاں جائے او، وارند بالا چشم و سر

الفت چناں دہ خلق را جز ایں نخواہد ہیچ کس　　ہر جا کہ بینند عالمے، مرد[ی] (؟) تو بینند او ایں مختصر

اصحابِ علم و معرفت ہر گہ ببینند سوئے آں　　علیہم بگیرد ہر حق، ہم راست سازد و زبر

چوں عیب دارم جملگی جز عیب در من ہیچ نہ　　صد عیب یابی بے شکے، ہرگز نہ بینی ایک ہنر

کردم ہوس چوں (؟) رفتار کبکا[1] ناز کنم　　بربادشد رفتار من، گشتم خجل چوں منکسر

گر یک سخن زیں جملگی، یابد قبولے نزد حق　　نازم چو حساں در عجم، گردم چو سحباں مفتخر

---

[1] کرم خوردہ

دارم امیدے از خدا خواہند چون عاشقان | بکنند ہمہ من دعا یا ہم نجاتے در قبر
سر نازکتر بگویم البشنو اے جانِ پدر | در خود نگر آں وجہ مطلق تا نگردی در بدر

مذکورہ بالا مناجات میں کوئی ایسی صراحت نہیں ہے، جس کی بنا پر ہم اسے حضرت رازِ الٰہی سے منسوب کر سکیں، مگر آخری شعر سے ہمارے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ مناجات حضرت موصوف کی ہی فکر کا نتیجہ ہے،

اس شعر کی شانِ نزول بیان کرتے ہوئے ملفوظات حضرت رازِ الٰہی کے مرتب عاقل خاں رازی[1] نے لکھا ہے کہ حضرت موصوف کو علم عروض و قافیہ میں مہارت نہ تھی، ان کے پیر و مرشد حضرت مسیح الاولیاء نے اس فن میں استفادہ کی اجازت بھی عطا کی، مگر انھوں نے اس کے بجائے عارفانہ حقائق و معارف سے مستفید ہونے کی تمنا ظاہر کی، مگر پھر خیال ہوا کہ مرشد کے حکم پر عمل ضروری ہے،

چوں گزیدی پیر ہاں، تسلیم شو | ہم چو موسیٰ زیر حکم خضر رو

اور حالت وجد میں مذکورہ بالا شعر ان کی زبان سے صادر ہوا،

بیتے موزون کہ از حضرت ایشان در حالت وجدان شرف صدور وعز ظہور یافتہ این ست[2]"

شعر

سر نازک تر .... الخ

"شرح ہیم کہانی[3]" کے آخر میں ایک طویل مناجات ہے، اس شرح کا ایک مکمل نسخہ حضرت سید محمد مطیع اللہ صاحب راشد (برہانپوری) کے کتب خانے میں محفوظ ہے، اور ۱۲ رجب ۱۲۰۶ھ

---

[1] عاقل خاں رازی کے حالات و تصانیف کے لیے ملاحظہ کیجیے بزم تیموریہ ص ۲۷۰ [2] ثمرات الحیات قلمی ورق ص ۵۳ الف

[3] شرح ہیم کہانی کا ایک مکمل نسخہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں اور ایک ناقص نسخہ کتب خانہ درگاہ پیر محمد شاہ احمد آباد میں بھی ہے۔

کا نقل شدہ ہے، ذیل کی مناجات اسی سے نقل کی گئی ہے۔

اے جمالِ تو کانِ محبوباں | عکسِ حسن تو جملہ خوباں
جلوۂ حسنِ تُست در ہمہ جا | از تو دارند جملہ نشو و نما
چشم آنکس کہ کردۂ تو وا | بنظر شس کے فتد بغیر سوا
تا کہ حسنِ تو گشتہ است عیاں | جذبۂ عشق تست در ہمہ جاں
ہمہ ذرات مست و بے خبر اند | از خودی ہائے خویش بگذشتند
حسن لیلےٰ کہ زد رہِ مجنوں | بُرد از کوئے عقل سوئے جنوں
ہوش وامق کہ زلف عذرا برد | دل و جانش بہ بیخودی بسپرد
لب شیریں کہ بود شور انگیز | رنج فرہاد و راحت پرویز
زاں ہمہ پرتو جمال تو بود | کہ دلِ ہر یکے ازان بربود
گرچہ جز یک جمال بیش نبود | در ہر آئینہ روئے خویش نمود
گشت کثرت نما در آئینہ ہا | مختلف گشت در معائنہ ہا
گاہ در گل گہے در خار | روئے در ہر لباس و در اطوار
ہر طرف جلوہ گر بشکل دگر | تو بہر شکل روئے او بنگر
گاہ در مومناں نماید روئے | گاہ در کافراں کشاید موئے
گہ بہ کعبہ گہے بہ مسجد ہا | پرتو روئے تست ... جہا
گاہ در بتگرو گہے بہ بتاں | جلوۂ خود نمودی اے جاناں
بت پرست و برہمن و خمار | از تو دانند موبمو اسرار
گہ ز روئے مضل گہے ہادی | ہمہ را پرورش تو خود دادی

چونکہ در اصل شان ہمی انگوم — ہمہ جا در وے قسمت جلوہ گرم

بردی از صورتِ دل مجنون — کردی اور انجمنِ خود مفتون

دلِ وامق بہ ہستی بردی — زلف عذرا بہانہ آوردی

روئے شیریں کہ بود راحت خیز — شہدِ فرہاد و شکر پرویز

ایں ہمہ جز بہانہ بیش نبود — کیست جز تو کہ روئے خویش نمود

دام پرویز و دانۂ فرہاد — حسن تو بود و دوست ایں فریاد

زد بہر جادہ سعادت مند — ساخت از زلفِ خویش جانش بند

بکمند و ز زلف ببند نہاد — کرد از جملہ بندہا آزاد

من ہم اے شہ یکے گدائے توام — از دل و جان خود فدائے توام

تا کہ جانم جدا شد از اعیان — جملہ دارند بر من آہ و فغان

گہ بری در سرائے خود بیناں — گہ فرستی بہ پیش بے دیناں

چند سرگشتہ داریم چوں باد — گہ بری بر خرابہ گہ آباد

چہ شود گر ازیں خلاص دہی — گہ ز اخلاص جامِ خاص دہی

بادشاہا مرا ز خویش رہاں — تا کہ باشم بچشم خویش نہاں

روز و شب کوسِ دولتِ تو زنم — گہ نیاید بخاطرم کہ منم

چند داری مرا ز خود مہجور — تو بہ نزد من است و من ز تو دور

گر بہ تیرم کشی گہے بہ تفنگ — صلح کردم بر ایں ندارم جنگ

پردۂ ما و من ز پیش رباے — بہ رخِ خویش چشم من بکشاے

چونکہ بر خویش چشم بکشایم — تو درآئی بچشمِ من نائم۔

ور بہ بینی نہ مرد ایں ہوسم — طلبِ شیر و کم تر از مگسم

بدلِ اہلِ درد راہم دہ — بصفِ بیدلاں پناہم دہ

سرِ من ساز خاکِ وے ویشاں — تا بپایند و بگذرند ایشان

حرز جانم نگاہِ ایشاں کن — دل و جانم براہ ایشاں کن

خاطرم رام کن ز صحبت شاں — وقت من ساز خوش ز قسمت شاں

ثمرات الحیات میں حضرت برہان راز الٰہی کا ذیل کا ہندی دوہرہ بھی ملتا ہے:

جھنتہ جھنتہ کھیلیں سچ مچ ہوئے — سچ مچ کھیلے برلا کوئے

مرتب ثمرات الحیات[1] نے اس دوہرہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت نے فرمایا کہ دورانِ سماع میں اہل طریقت پر وجد طاری ہو جاتا ہے، اور وہ رقص کرنے لگتے ہیں۔ اس حالت میں وہ قید بقا سے رہا اور حدود زمان و مکان سے پرے ہو جاتے ہیں۔ وجد سے فراغ کے بعد ان کے لیے وضو لازمی نہیں اور اسی طہارت سے نماز جائز ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں کہ سماع کا نتیجہ بے خودی ہے، جس سے نقض طہارت ہوتا ہے حضرت موصوف نے فرمایا کہ "ظہورِ جذبات سے شعور کا سقوط ایسا ہے، جیسے آفتاب کے سامنے چراغ کی روشنی کا مدہم ہونا، پھر حدیث شریف "اذا رایتم اہل البلاء فابکوا و ان لم تبکوا فتباکوا" کا حوالہ دیکر فرمایا کہ "اہل درد کو دیکھ کر گریہ و زاری کرو" ایک روایت میں حضرت رسالت مآبؐ نے صحابۂ کرام سے فرمایا کہ "قرآن کی تلاوت کے وقت گریہ کرو" اس ارشاد کے بعد مذکورۂ بالا دوہرہ پڑھا،

اگرچہ حضرت کو خود شعر و سخن سے ذوق تھا، اور شاعری بھی فرماتے تھے، مگر عاقل خاں رازی

---

[1] ثمرات الحیات (قلمی) ورق ۵۵ (ب)

کے استفسار شعر گوئی پر انھوں نے پہلے یہ آیت پڑھی "وما علمنا الشعر وما ینبغی لہ" اور یہ ہدایت فرمائی کہ اس کو اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ پھر "وان من الشعر لحکمۃ" کا مقولہ نقل کرکے موصوف کو واردات نظم کرنے اور خرافات سے پرہیز کرنے کی تلقین کی۔[1]

مندرجۂ بالا منظوم کلام کے علاوہ ان کی ایک مثنوی کتب خانہ پیر محمد شاہ (احمد آباد) میں ایک بیاض میں مرقوم ہے، جس کے سرورق پر لکھا ہے "مثنوی شیخ برہانؒ، برہان پوری"۔ اس مثنوی میں کہیں بھی آپ کا تخلص نہیں ہے، صرف ایک شعر میں (عیسوی) کی طرف اشارہ ہے،

عیسوی را عشق او بے خود نمود عشق را بے سود ان اے اہل خود

عیسوی سے مراد یہاں حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہ نہیں ہیں، جیسا کہ بشیر محمد خاں صاحب نے اپنے مضمون "حضرت شاہ برہان الدین راز الٰہی" میں بتلایا ہے،[2] بلکہ ان کے صاحبزادے "بابا فتح محمد محدث" ہیں، جو اپنے دور کے جید عالم، فاضل اجل، حافظ، قاری، محدث، مفسر اور فقیہ تھے، ان علوم کے علاوہ شعر و سخن سے بھی ذوق رکھتے تھے، اور عیسوی تخلص کرتے تھے،

محدث موصوف کی ایک تصنیف مفتاح الصلوٰۃ میں تعین اوقات نماز کے ذیل میں جان سایہ کا ذکر ہے، ان کا ایک قطعہ ملتا ہے جس کے آخری شعر میں عیسوی تخلص ہے۔

باز از حمل دو نیم ہست، گر عاقلی عامل بشو بہر خدا گفتم بر تو اے عیسوی! ایں نظم را

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زیر نظر مثنوی میں عیسوی اگر شاعر کا تخلص قرار دیا جائے تو اس مثنوی کو حضرت محدث کی فکر کا نتیجہ تسلیم کرنا ہوگا، اس صورت میں مثنوی کا غلط انتساب سہو کاتب پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

راقم السطور کی ناقص رائے میں حضرت راز الٰہی نے مذکورۂ بالا شعر میں اپنے مرشد زادہ

[1] ثمرات الحیات (قلمی) ورق ۱۰، [2] معارف نمبر ۶ جلد ۷۰، ص ۴۲۴

کی طرف اشارہ کیا ہے، جو عشق الٰہی میں سرشار تھے،

زیر نظر مثنوی دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں ۱۹۲ اور دوسرے میں ۱۶۲ اشعار ہیں، بعض اشعار نقل در نقل کے تغیرات سے وزن سے خارج ہو گئے ہیں، بعض اشعار میں ایسے الفاظ لکھ دیے گئے ہیں یا ایسی تحریف ہو گئی ہے جس کا نفس مضمون متحمل نہیں ہو سکتا،

زیر بحث مثنوی ایک ایسے بزرگ کی تصنیف ہے جو وحدت الوجودی مشرب رکھتے تھے، چنانچہ مثنوی میں جابجا اسی کے غوامض و رموز کی تشریح کی ہے، یہ مثنوی خاصی طویل ہے، کل نقل کرنے کی گنجایش نہیں ہے، اس لیے صرف اول و آخر کے کچھ اشعار نقل کیے جاتے ہیں

ذات حق چوں بود اول بے نشاں نے تعین داشت وے نام و نشاں

او وجود صرف بود و ذات بحت زاں معرا از حقیقت بود و نعت

از ظہور و از بطون و از صفات او مبرا بود از جملہ جہات

نیست از نعت و نسب آں ذات را تا کہ او را بے نشاں گفتن خطاست

انبعاثے شد ازاں دریاے جود تا کہ ظاہر گشت از وے ایں نمود

بے نشاں اندر نشاں زاں[1] آمدہ لاتعین در تعین ها شدہ

آمدش در عالم ذات بحت خویش انچہ قابل بود کاں آمد نہ بیش[2]

ہر نشانِ بے نشاں در خود بدید لاتعین در تعین شد پدید

گشت حاضر در کمال خویشتن انچہ اول بود آخر ذو المنن

عاشق آمد بر کمال خویش را خواست تا جوید وصال خویش را

فیض بخشد خستۂ دل ریش را تا بدست آرد دل درویش را

[1] زاں کے بجائے "ہا" چاہیے۔ "نشاں ہا" [2] نہ بیش کے بجائے 'بہ بیش' چاہیے۔

خاتمہ کے اشعار یہ ہیں:

ما و من را پردۂ خود ساختہ
تا بخود بر خود نظر انداختہ

خود شدہ عاشق بروے خویشتن
کس نباشد در میان ذو المنن

نیست کشتہ خود شدہ اسرار جو
در درونِ شہر اندر چار سو

از انا الحق دم زند منصور وار
در شریعت خود شدہ بالائے دار

عاشق و معشوق خود بودہ است و بس
درمیاں ناید بجز او ہیچ کس

ایں سخن آخر ندارد ختم کن
عشق وے از مشرب خود دم مزن

اعتقاد صوفیہ گفتم تمام
در عمل آرید یاران والسلام

من نگویم سرِ اسرار ازل
خود بگوید پیش خود اس بے مثل

اوست اول اوست آخر در جہاں
اوست ظاہر اوست باطن بے گماں

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں
کے
عہد کی ایک جھلک

علاء الدین خلجی کے بارہ میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک ظالم، سفاک، متعصب اور مذہبی حیثیت سے بدعقیدہ فرمانروا تھا، لیکن ۱۹۵۰ء میں پروفیسر کے، اس، لال ایم، اے، ڈی فل نے انگریزی میں خلجیوں کی تاریخ کے نام سے جو کتاب لکھکر شائع کی ہے، اس کے حسب ذیل اقتباسات سے ہندوستان کے اس فرمانروا کے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں وہ دور ہو جاتی ہیں:

ڈاکٹر کے، اس، لال رقمطراز ہیں:-

ضیاء الدین برنی کی تاریخ کے سرسری مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علاء الدین اگر مذہب کا منکر نہ تھا تو کم ازکم اس سے بدعقیدگی ضرور رکھتا تھا، لیکن ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے، یہ ضرور ہے کہ وہ کلام پاک کی تلاوت نہیں کرتا تھا، کیونکہ وہ پڑھا لکھا نہ تھا، وہ رمضان کے روزے اور نماز کا بھی پابند نہ تھا، اور شاید وہی ایک ایسا سلطان تھا جو جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے جامع مسجد نہیں جاتا تھا، وہ سلطنت کے نظم و نسق میں مذہب کی مداخلت بھی گوارا نہ کرتا تھا، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ ایک سچا مسلمان تھا، اس کو اپنے مذہب سے بڑی عقیدت تھی، اور وہ

کوئی ایسی بات سننا پسند نہ کرتا، جس سے مذہبی بدعقیدگی کا اظہار ہوتا ہو،

وہ اپنے معاصر صوفیہ کا بڑا احترام کرتا تھا، حضرت نظام الدین اولیاء سے تو خود کبھی نہیں ملا، لیکن
ان کے روحانی تصرفات کا بڑا معتقد تھا، اور اپنے امراء کے توسط سے ان کی دعاؤں کا ہمیشہ
طلبگار رہتا تھا، آخری زندگی میں ان کا اور بھی گرویدہ ہو گیا تھا، اور اس کے خاندان کے تقریباً
تمام افراد ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گئے تھے، جب مولانا شمس الدین ترک مصر سے ہندوستان
آئے اور علاء الدین سے ملے بغیر واپس چلے گئے تو اس کو بڑا قلق ہوا، الغ خاں مرا تو اس کے ایصال
ثواب کے لیے اس نے کثیر رقم خیرات کی، ممکن ہے کہ اس کو سیاسی چال پر محمول کیا جائے لیکن اسکی
اور دوسری باتوں سے یہ پوری طرح ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اپنی نجی زندگی ایک اچھے مسلمان کی
طرح بسر کی، امیر خسرو، عصامی، شمس الدین ترک اور وصاف کی نظروں میں علاء الدین ایک سچا
مسلمان تھا، عصامی کا تو یہ بھی بیان ہے کہ سلطان نے شریعت کے اصولوں کو ہمیشہ پیش نظر
رکھا اور اپنے عمل میں اسلامیت کا اظہار کیا، اور اس کے عدل و انصاف کی وجہ سے سلطنت
مستحکم ہوئی، لوگ اطاعت گذار رہے، اور عام خوش حالی رہی،

اس پر تعصب کا بھی الزام ہے، لیکن اگر اس کے کردار کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ
ہوگا کہ اس نے کسی مذہبی بنیاد پر ہندوؤں کو نہیں دبایا، البتہ اس کے سخت نظام حکومت کی وجہ سے
سازش کرنے والے امیروں، بے جا فائدہ اٹھانے والے تاجروں، اور سرکش زمینداروں کو بڑا
نقصان پہنچا، اور اس سلسلے میں جو مذہبی قوانین نافذ ہوئے ان سے متوسط درجہ کے تاجروں
اور غریب کسانوں کو بھی کچھ سختیاں جھیلنی پڑیں، لیکن ملک کی آبادی اور اس کے زمینداروں کے
اور کاشتکاروں کی اکثریت ہندوؤں ہی کی تھی، اس لیے جو بھی تجارتی یا مالی قانون نافذ ہوتا
اس سے ان کا قدرۃً ہندوؤں پر زیادہ اثر پڑتا، اگر علاء الدین کسی ہندو راجہ کے علاقہ پر حملہ کرتا

اور اس حملہ میں ہندوؤں کو زیادہ نقصان پہنچتا، یا ہندو راجاؤں سے جنگی ٹیکس جس کا سرکاری
نام جزیہ تھا لیا جاتا تو یہ اس لیے نہیں کہ علاء الدین متعصب مسلمان تھا، کوئی ایسی مثال پیش نہیں
کی جا سکتی، جس سے یہ ثابت ہو کہ علاء الدین نے ہندوؤں کو محض ان کے ہندو ہونے کی وجہ
سے ستایا، یا مسلمانوں کے ساتھ اس لیے لطف و کرم کا برتاؤ کیا کہ وہ مسلمان تھے، اگر تاجروں
کو نقصان ہوتا تھا تو صرف ہندو تاجر نقصان نہیں اٹھاتے تھے، اگر محکمۂ مال کی طرف سے کوئی ظالمانہ
قانون نافذ ہوتا تو اس کا نفاذ صرف ہندوؤں پر نہیں کیا جاتا تھا، اور اگر امراء کو دبا کر رکھا جاتا
تو صرف ہندو امراء ہی اس کے شکار نہیں ہوتے تھے، علاء الدین نے اپنے امراء کے خلاف سخت ترین
رویہ اختیار کیا تھا، حالانکہ اس کے زمانہ میں ہندو امراء نہ ہونے کے برابر تھے، اس کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے
کہ مسلمانوں کی حکومت کے ابتدائی دور میں مسلمان سلاطین کو اپنا اقتدار ایک ایسی جگہ قائم کرنا
پڑا جہاں کے لوگ مذہب، معاشرت اور کلچر میں ان سے بالکل ہی مختلف تھے، ایسی حالت میں وہ
ایسے لوگوں کو اونچے عہدے دیکر ان پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے، ہندو راجاؤں سے ان کی لڑائیاں
برابر جاری رہیں، اور ترکوں کے حکمراں طبقہ اور یہاں کی مفتوح رعایا میں غیر شعوری طور پر کشمکش
قائم تھی، ایسی حالت میں ان سلاطین سے یہ امید کیسے رکھی جا سکتی ہے کہ وہ یہاں کے لوگوں کے
ساتھ فیاضانہ برتاؤ کرتے، اور ان کے لیے بڑے عہدوں کے دروازے کھلے رکھتے، اس لیے اگر
علاء الدین کے عہد میں ہندو عہدیدار نظر نہیں آتے تو کوئی تعجب کی بات نہیں،

علاء الدین ضرورت سے زیادہ بلند حوصلہ تھا، اسے اپنے نام کو دوام بخشنے کی بڑی آرزو
تھی، اس لیے کبھی وہ سکندر اعظم کی طرح فتوحات حاصل کرنے کے لیے بے چین ہو جاتا، اور کبھی کوئی
نیا مذہب بنا کر انسانی تاریخ میں زندہ جاوید بننے کے لیے سوچتا، اس کی ان تمناؤں کو اس کی
شراب نوشی، اس کے ہمجلیسوں کی خوشامدانہ باتیں اور بڑے سے بڑے عزائم میں اس کی

کامیابی شہ دیا کرتی تھی، لیکن جب کوئی اس کو بہی خواہانہ مشورہ دیتا تو اس کو خاموشی سے سنتا تھا، ملک علاء الملک نے اس کو جو مفید نصیحتیں کی تھیں، اس کے اثر سے وہ اپنے بہت سے ارادوں سے باز آگیا، اور اس کی توجہ مغلوں کو شکست دے کر ہندوستان کی ریاستوں کو تسخیر کرنے کی جانب منتقل ہوگئی، فتوحات ہوں یا عظیم الشان تعمیرات یا اقتصادی اصلاحات ہر ایک چیز میں سلطان کی یہی خواہش رہتی تھی کہ وہ کوئی ایسا غیر معمولی کارنامہ انجام دے جس سے اس کے نام کو بقائے دوام حاصل ہو، اس کے بلند حوصلوں نے اس کو ایک ہوشمند مدبر بنا دیا تھا، اس کو جب کوئی بڑا کام انجام دینے کا خیال پیدا ہوتا تو پہلے اس کے ہر پہلو کو اچھی طرح سوچ لیتا، چنانچہ جب وہ دیوگیری پر حملہ کرنے کے لیے جا رہا تھا تو اس کی پوری احتیاط کی کہ اس کی خبر جلال الدین خلجی کو نہ پہنچنے پائے جو ایک قابل تعریف بات ہے، جب وہ کسی راجہ سے لڑتا یا مغل حملہ آوروں کا مقابلہ کرتا تو ہر حال میں غیر معمولی احتیاط سے کام لیتا، اس نے ایک بڑی سلطنت وراثت میں نہیں پائی تھی، بلکہ خود بنائی تھی، اس لیے وہ زندگی کی تلخی اور شیرینی دونوں سے واقف تھا، اور اس کو ہر کام کو ٹھنڈے دل سے غور و فکر کر کے انجام دینے کا پورا تجربہ تھا، وہ کسی خوف کی بنا پر احتیاط نہیں کرتا تھا، جب وہ کسی کام کا ارادہ کر لیتا، تو اس کو پورے عزم اور قوت کے ساتھ تکمیل تک پہنچاتا، جس کی اس میں پوری صلاحیتیں موجود تھیں، اس نے اپنے چچا کو قتل کر کے تخت و تاج حاصل کیا تھا، لیکن واقعات نے ثابت کیا کہ وہ ایک بڑا جنرل تھا، کہا جاتا ہے کہ وہ خود کوئی بڑا جنرل نہ تھا، بلکہ تمام فتوحات اسکو الغ خاں اور نائب کافور کی بدولت حاصل ہوئیں، لیکن یہ کہنا صحیح نہیں، جب اس کی شخصیت بالکل گمنام تھی، اس وقت بھی اس نے ملک چھجو (۱۲۹۰ء) اور بھیلسا (۱۲۹۲ء) کی مہموں میں اپنی سپہگری کا ثبوت دیا تھا، اور دیوگیری کی غیر معمولی تسخیر میں تو اس نے ایک فوجی رہنما کی حیثیت سے اپنا سکہ پوری طرح جما لیا، تخت سلطنت پر بیٹھنے کے بعد وہ دار السلطنت کو چھوڑ نہیں سکتا تھا، اس لیے اس نے

الغ خاں اور نصرت خاں کو ملتان اور گجرات کی مہم پر بھیجا تھا، لیکن ۱۲۹۹ء میں اس نے خود قتلغ خواجہ کو شکست دی، پھر ۱۳۰۳ء میں ترغی نے منگولوں کا جو زبردست حملہ ہندوستان پر کیا، اس کو بھی اس نے بڑی بہادری سے روکا، منگولوں کے مقابلہ کے لیے جب وہ روانہ ہو رہا تھا، اس وقت اس نے علاء الملک سے جو گفتگو کی تھی، اس سے اس کی شجاعت اور بہادری کے جوہر کا پورا اندازہ ہوتا ہے، اس نے دہلی کے چاروں طرف خندق کھدوا کر منگولوں کو جس طرح روکا ہے اس سے اس کی غیر معمولی جنگی قابلیت ظاہر ہوتی ہے، منگولوں اور راجپوتوں کے ساتھ اس کے بڑے بڑے معرکے ہوئے، جن میں اس نے اپنی فوجی تنظیم، جنگی بصیرت اور بہادرانہ جوہر کا پورا ثبوت دیا، جب الغ خاں رنتھنبور کے محاصرہ سے تنگ کر واپس ہوگیا تو علاء الدین خود اس کی تسخیر کے لیے روانہ ہوا، اور مسلسل مشقت اور سپاہیانہ کمال دکھا کر اس کو فتح کر لیا، ۱۳۰۳ء میں علاء الدین نے چتوڑ کی تسخیر کی، جس کو اب تک دہلی کا کوئی سلطان نہ لے سکا تھا، اور اکبر جیسا طاقتور حکمراں بھی آسانی سے اس پر قبضہ نہ کر سکا، چتوڑ کی تسخیر کے بعد منگولوں نے اتنا زبردست حملہ کیا کہ ہندوستان کی سلطنت کے لیے موت و زیست کا سوال پیدا ہو گیا، لیکن علاء الدین نے اس پر بھی قابو پا لیا، ۱۳۰۳ء کے بعد علاء الدین سلطنت کے نظم و نسق کی اصلاح میں مشغول رہا، اس لیے پایۂ تخت سے باہر نہ جا سکا، لیکن اس کی فتوحات عین الملک اور نائب کافور جیسے فوجی سرداروں کے ذریعہ سے برابر جاری رہیں، اس کے سپاہیانہ تدبر کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کے فوجی سردار اس زمانہ میں بھی جبکہ ہر فوجی سردار کی یہ خواہش رہتی تھی کہ وہ کسی طرح تخت و تاج کا مالک بن جائے، اس کے اطاعت گذار رہے، الغ خاں، نصرت خاں، ملک کافور اور غازی ملک جیسے بڑے بڑے فوجی سرداروں کا اس کا فرمانبردار بنا رہنا اس کی ہوش مندی کی دلیل ہے، درحقیقت وہ تمام فوجی افسروں کا سردار تھا، اور خود بھی سپہگری اور جنگی فنون کا بڑا ماہر تھا، اپنے

دشمنوں کو آسانی سے مغالطے میں لاکر اور انکو تھکا کر آزمایش میں ڈالدیتا تھا۔

ملکی نظم ونسق میں اس کے کارنامے اور بھی نمایاں ہیں، بلکہ اس کی فوجی قابلیت اسکی انتظامی ہوشمندی کے سامنے ماند پڑجاتی ہے۔ اس نے ملک کے لیے عجیب وغریب قسم کی اصلاحات جاری کیں، اور اپنی خواہش کے مطابق حکمرانی کی، سپاہیوں کی بھرتی براہ راست اپنی نگرانی میں کیا کرتا، گھوڑوں پر داغ لگوانا شروع کیا، فوجیوں کی نقدی تنخواہ کا رواج جاری کیا، بازاروں کے نرخ کو قابو میں کیا، راشن بندی کرائی، پرمٹ (حصول اجازت) کی روایت قائم کی، اسی طرح کی اور بھی نئی نئی باتیں ایجاد کیں جو پہلے سلاطین کے ذہن میں نہیں آسکی تھیں، اس کے لائق مشیر مثلاً ظفر خاں، نصرت خاں، الغ خاں اور علاء الملک وغیرہ ۱۳۰۲ء سے پہلے ہی مرچکے تھے، اسلیے اس نے جو کچھ کیا وہ سب اسکے غیر معمولی ذہن کا کرشمہ تھا، اس نے زمین کی پیمایش شروع کرائی، لوکل گورنمنٹ قائم کرنے کی کوشش کی، اور مالگذاری کی تحصیل کے لیے قوانین بنائے، ان سب باتوں میں اسی کو اولیت حاصل ہے، وہ جو نظام یا قانون نافذ کرتا اس پر عمل درآمد کی پوری کوشش کرتا تھا، چھوٹے چھوٹے بچوں کو اس غرض سے چپکے سے بازار بھیجا کرتا تھا کہ دوکاندار مقررہ نرخ کے مطابق چیزیں فروخت کرتے ہیں کہ نہیں۔

علاء الدین شہنشاہیت کا علمبردار اور اپنی سلطنت کے حدود کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کا بڑا دلدادہ تھا، لیکن فتح حاصل کرنے کے بعد نامناسب اور ناخوشگوار رویہ اختیار کرنا ملکی مصالح کے خلاف سمجھتا تھا، دکن کے راجاؤں کو شکست دے کر ان سے زیادہ سے زیادہ خراج وصول کیا، لیکن انکو ان کے علاقوں میں برقرار رکھا، اس طرح اسکے بڑے سے بڑے دشمن اسکے دوست بن گئے، دیوگیری اور دوارسمندر کے راجاؤں کا استقبال جس فراخ حوصلگی سے اس نے کیا، اور انکو خلعت، خطابات اور اپنے علاقے میں حکمراں بنا کر جس طرح انکی عزت افزائی کی اس سے اس بات کا پورا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے سیاسی حالات پر بڑی اچھی نظر رکھتا تھا، اس نے اپنی سیاسی بصیرت سے ان کو خوب سمجھ لیا تھا کہ ایسے علاقے کو فتح کرنے سے کوئی فائدہ نہیں جہاں

اس کا قدم اچھی طرح جم نہ سکے۔ اس لیے دکن میں اسکی پالیسی کی وجہ سے بہت سے راجہ اسکے حلیف بنگئے جو نہ صرف اسکے اطاعت گذار اور فرمانبردار رہے بلکہ بہت سے فوجی معرکوں میں اسکو مدد بھی دی، یہ عجیب بات ہے کہ علاء الدین کے فوجی سرداروں نے جن علاقوں میں خونریزی اور آتشباری کی وہاں کے راجہ علاء الدین کے بہت زیادہ فرمانبردار ہوگئے، علاء الدین ہی پہلا مسلمان فرمانروا ہے جو ہندو راجاؤں کو انکے علاقوں میں حکمراں بنائے رکھتا تھا، بشرطیکہ وہ خراج دیتے رہتے۔

علاء الدین میں بڑی جدت پسندی تھی، اسکی بعض جنگی اور مالی اصلاحات کو بعد کے فرمانرواؤں نے جاری رکھا، شیر شاہ نے علاء الدین کے بہت سے فوجی اصلاحات کو اپنی حکومت میں رائج کیا، علاء الدین نے زراعت اور مالگذاری کے سلسلہ میں جو قوانین بنائے تھے انکو شیر شاہ اور اکبر دونوں نے قبول کیا۔

اس میں شک نہیں کہ علاء الدین کے نظم ونسق میں کچھ نقص ضرور تھا، اس کی حکومت شخصی تھی، جس کا دارومدار رائے عامہ کے بجائے فوجی قوت پر تھا۔ اور لوگ ڈر کر اسکی اطاعت کرتے تھے۔ اور نہ اس سے محبت کرتے اور نہ اسکا احترام کرتے تھے، وہ بھی اپنی فوجی طاقت برقرار رکھنے کے لیے اقتصادی خوشحالی کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتا تھا، بلکہ تجارت کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا، تاجروں کو پوری آزادی حاصل نہ تھی، کاشتکاروں کو بھی بڑی مشقت اٹھانی پڑتی تھی، اس کے جاسوس اس طرح پھیلے رہتے تھے کہ لوگوں کی زندگی اجیرن ہوگئی تھی، امرا کو اس نے بہت دبا رکھا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے مرنے کے بعد حکومت پر بڑا نازک وقت آگیا، لیکن جب علاء الدین کی کارگذاریوں کا ناقدانہ اور گہرا مطالعہ کیا جاتا ہے تو سارے الزامات دور ہوجاتے ہیں، اس کے روشن کارنامے زیادہ ہیں، اس نے ایک چھوٹی سلطنت کو امپائر بنادیا، جس سے ہندوستان کے بیشتر علاقے ملحق ہوگئے تھے، وہ ہندوستان کا پہلا فرمانروا ہے جس نے دکن کو اپنی حکومت میں ملاکر اس ملک کو ایک سیاسی وحدت عطا کرنے کی کوشش کی، اس نے منگولوں کو پسپا کرکے ہندوستان میں ان کی حکومت کے خواب کو بالکل ہی خواب پریشاں کردیا، اس کی موت کے وقت بعض علاقوں نے آزادی کا

اعلان کر دیا تھا، لیکن اس سے علاء الدین کے کارناموں پر کوئی حرف نہیں رکھ سکتا، اس نے جنوبی ہند کے دور دراز علاقوں میں پہنچکر وہاں کے راجاؤں کو پسپا کیا، جس کے بعد اس کے عیش پسند جانشین قطب الدین کو بھی وہاں کے راجا کو سرنگوں کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی، علاء الدین کی فتوحات دیرپا نہ رہی ہوں لیکن اس کے نتائج بڑے دور رس ثابت ہوئے، اسی نے یہ کر دکھایا کہ وندھیا کے پار کے علاقے بھی تسخیر کیے جا سکتے ہیں،

اس نے ایسا نظام حکومت قائم کر رکھا تھا کہ جس کی بدولت وہ کامیابی سے دو قرن تک حکومت کرتا رہا، اور اس کے بنائے ہوئے ضوابط آگے چل کر نمونے کے طور پر قابل تقلید ہوئے، ضیاء الدین برنی نے اس کے عہد حکومت کے بہت سے شاندار کارنامے گنوائے ہیں، جو کسی دوسرے حکمراں کے عہد میں نہیں پائے جاتے، مثلاً (۱) ضروریات زندگی کی چیزیں سستی ملتی تھیں، اور قحط کے زمانے میں بھی ان کے نرخ مقرر تھے (۲) اس دور میں بہت سی فتوحات ہوئیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کامیابی مہم سے پہلے ہی حاصل ہو جاتی تھی (۳) منگولوں کو بری طرح پسپا کیا گیا، (۴) ایک بہت بڑی فوج کم تنخواہ پر مطمئن اور آسودہ حال رہی، (۵) سرکش زمیندار بالکل دبے رہے (۶) سڑکیں اور شاہراہیں بالکل محفوظ تھیں، رہزن ہی گذرگاہوں کے محافظ بنا دیے گئے تھے (۷) تاجروں کو ایماندار بننے پر مجبور کیا گیا، (۸) مضبوط عمارتیں بکثرت بنائی گئیں، (۹) ہندو اطاعت گذار بن کر رہے اور مسلمانوں نے سچائی، پرہیزگاری اور عدل و انصاف کی زندگی بسر کی (۱۰) اس عہد میں ارباب ہنر اور اصحاب علم کا اتنا بڑا اجتماع ہو گیا تھا کہ کسی اور دور میں نہیں ہوا،

(ص، ع)

ادبیات

آہ حضرت سہیل

از

جناب یحییٰ اعظمی

ترے غم کی اس میں باقی تھی کہاں تابِ رقم ہو چکا تھا خستہ مدت سے مرا محزوں قلم

وہ قلم جس کو بتائے تو نے اسرارِ ادب وہ قلم جس کو سکھائے تو نے آدابِ رقم

تھی زباں جس کی تہِ فیضِ نوائے نغمہ سنج آستانِ فضل پر تیرے جبیں تھی جس کی خم

آج ہے سر در گریباں تیرے ماتم کے لیے تھا مقدر اس کی قسمت میں تری رحلت کا غم

حضرت سید کے ماتم سے نہ تھی فارغ ہنوز دل میں تازہ تھا ابھی تک آہ یہ داغِ الم

ہو گئے رخصت وطن سے آہ اب اقبال بھی ہو گیا صد حیف دورِ بزمِ شبلی مختتم

کون اب کھولے گا ہم پر شعر و دانش کے رموز ذہن کس کا اب کرے گا فاش اسرار و حکم

آستانِ فیض تیرا تھا تو کچھ بھی غم نہ تھا عقدۂ دشوار لیکر اب کہاں جائیں گے ہم

کون فیضانِ نظر سے اب نوازے گا ہمیں آستاں پر کس کے حاضر ہونگے اب ہم صبحدم

کس کی تنقید و نظر سے ہوگا معمور اب ادب بخشدے گا گنجِ تحقیق و ہنر کس کا قلم

اٹھ چکے تھے دورِ پیشیں کے سب اربابِ کمال اک ترے دم سے تھا قائم شعر و دانش کا بھرم

تیرا ذہن و فکر تھا عہدِ سلف کی یادگار
ایسے طبّاع و ذہین اس دور میں اٹھتے ہیں کم

عصرِ حاضر میں تھا عرفیؔ و نظیریؔ کا نظیر
در حقیقت ہند میں تیرا وجود مغتنم

رشکِ قاآنیؔ، حریفِ انوریؔ، جانِ کمال
نازِ غالبؔ، افتخارِ "صاحبِ شعر العجم"

تیرا اعجازِ خطابت، تیرا طغرائے کمال
یونین کے ذرہ ذرہ پر ہے اب تک مرتسم

ہے علی گڈھ کے در و دیوار پر نقش آج بھی
تیرا مجدِ علم و دانش، تیرا فضلِ محترم

پیش کر سکتے نہیں تیرے قصائد کا جواب
ہیں یہاں قاصر مشاہیر سخندانِ عجم

اے سہیلؔ اے زمزمہ پیرائے نعت و منقبت
تیرے نغموں سے ہے معمور آج گلزارِ ارم

بارگاہِ قدس ہے اور ارمغانِ نعت ہے
حشر میں تیری شفاعت کے لیے یہ کیا ہے کم

رحمتِ حق بڑھ کے لے لیگی تجھے آغوش میں
نکتہ سنجِ نعت! تیری "موجِ کوثر" کی قسم

آہ اے اقبالِ فن اے بلبلِ باغِ ادب
تیرے رنگیں زمزموں سے ہو گئے محروم ہم

باغِ گیتی میں نہ ہوگا اب نوا پیرا سہیلؔ
غیر ممکن ہے کرے خاکِ وطن پیدا سہیلؔ

کائنات

(تخلیق سے پہلے)

از جناب فضا ابن فیضی

روش روش پہ خموشی تھی جوئبار خموش
نسیم و نکہت و نزہت کے آبشار خموش

غمِ سکوت میں ڈوبا تھا لحنِ ساز ابھی
کہ پر فشاں نہ تھی روحِ نیاز و ناز ابھی

افق سے دور کہیں آفتاب سوتا تھا
اداس چاند مقدر کو اپنے روتا تھا

نہ ربطِ خاص تھا کچھ برگِ گل کو شبنم سے
یہ زخمِ دل ابھی نا آشنا تھے مرہم سے

کرن سے سینۂ شبنم میں ارتعاش نہ تھا
صدف پہ اپنے گہر کا مقام فاش نہ تھا

تھا جن کا ایک تبسم بہارِ خلدِ بریں
ہنوز وہ گل و لالہ نہاں تھے زیرِ زمیں

نگاہ فیضِ تجلی سے تھی ابھی محروم
کلی کو رازِ شگفتن ابھی نہ تھا معلوم

لہو ہنوز نہ دوڑا تھا نبضِ امکاں میں
کوئی سحر نہ تھی بیدار خاورستاں میں

نہ ایسا فرقِ مراتب ان ذرات میں تھا
بس ایک چاکِ گریباں کائنات میں تھا

(تخلیق کے بعد)

فضائے ارض و سما جلوہ آفریں اتنی
یہ کائنات تو پہلے نہ تھی حسیں اتنی

ذرا سی بھی جو ستاروں نے آنکھ جھپکائی
خمِ افق سے نبیذِ سحر چھلک آئی

ہر ایک ڈوبی ہوئی نبض میں لہو آیا
زمیں پہ نیرِ اعظم نے نور برسایا

خود اپنے زخموں کا منہ چومنے لگے مرہم
کرن کی لو سے دھڑکنے لگا دلِ شبنم

یہ آب و گل کے چہکتے ہوئے صنم خانے
چلی ہے موجِ ہوا نکہتوں کو بہلانے

چمن میں قافلۂ سبزہ و نسیم آئے
فروغِ نور سے نابود ہو گئے سائے

سرور و کیفیتِ رنگ و بو کے میخانے
چھلک پڑے ہیں دماغ و نظر کے پیمانے

ادم طراز ہے دشت و جبل کی ویرانی
نوا فروش ہے خاموشیوں کی طغیانی

ضمیرِ کوکب و مہتاب تیرہ ناک نہیں
کہ آب و گل کے گریباں میں کوئی چاک نہیں

(انسان عہدِ رفتہ میں)

وہ روحِ حکمت و رنگِ جمالِ یکتائی
حریمِ قدس میں جس کی ہوئی پذیرائی

گمان اس کی جلو میں یقین تک آئے
کہ جبرئیل امیں بھی زمین تک آئے

اسی کی فکر سے ٹوٹا فسونِ تیرہ شبی | بجھا اسی کے نفس سے چراغِ بولہبی
رہی متاعِ امانت جو سر بسجدہ اسکی | تپ جنوں سے لہکتی رہی خرد اسکی
فرشتہ صید، ہما بہ بغیر ناوک و تیر | ہیں اس کے زلّہ ربا جبرئیل پاک ضمیر
کہاں یہ اور کہاں شیوۂ زبونِ حیات | اسی نے عام کیا سوزِ اندرونِ حیات
خرد یہ رازِ دو عالم ہے آشکار اس سے | جنون ہے جوشِ تپیدن سے ہمکنار اس سے
یقین و علم سے عقبا کو روشناس کیا | ترے وجود سے دنیا کو روشناس کیا
ہر اک نظر تھی گہر سنج و کامراں اسکی | بہار چہرے پہ ملتی رہی خزاں اسکی

(انسان عہد حاضر میں)

سحر گزر گئی خود روشنی کو ٹھکرا کر | پلی ہے رات مہ و کہکشاں کا غم کھا کر
سیاہ راتوں سے سورج ہیں مٹھّن کتنے | سیاہیوں کی طرف مڑ گئے ہیں دن کتنے
خود آگہی و خودی کے ایاغ ٹوٹ گئے | ہوائے تند سے لڑ کر چراغ ٹوٹ گئے
غریق زہر ہلاہل ہے سفینۂ نوش | خضر کے بھیس میں ہیں کس قدر ضمیر فروش
وہ جس کا سینۂ روشن تھا مایہ دارِ علوم | وہی ہے اب نفسِ جبرئیل سے محروم
دلوں کے کنج میں کینے کا سانپ بستا ہے | وہ آدمی ہی ہے جو آدمی کو ڈستا ہے
یہ فکر عیش یہ تہذیب و کفر کے ناسور | یہ بے نگاہ کلیم اور یہ خرابۂ طور
زمیں کے دوش پہ فکر و نظر کے یہ تابوت | یہ مقبرہ ہے الٰہی اک عالمِ ناسوت

تمام سعیٔ کرم رائگاں ہوئی تیری
متاعِ سود سپردِ زیاں ہوئی تیری

مطبوعات جدیدہ

صحیفہ ہمام بن منبہ ۔ مرتبہ جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۶ ۴ ۱ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت ہے پتہ الہدیٰ بک ایجنسی نظام شاہی روڈ، حیدرآباد دکن۔

ہمام بن منبہ المتوفی ۱۳۱ھ مشہور اہل کتاب تابعی ہیں، وہ حضرت ابوہریرہؓ صحابی کے خاص شاگرد تھے، انھوں نے ہمام کے لیے ۱۳۸ حدیثوں کا ایک مجموعہ مرتب کرکے ان کو املا کرایا تھا، جو صحیفہ ہمام بن منبہ کے نام سے مشہور ہے، ان کے سلسلہ تلامذہ میں معمر بن ارشد، عبد الرزاق بن شیب صاحب مصنف امام احمد بن حنبل اور ان کے بعد کے لوگوں میں برابر اس صحیفہ کے درس و سماع کا سلسلہ جاری رہا، امام احمد نے مسند میں ہمام کی حدیثوں کے تحت میں یہ پورا صحیفہ نقل کیا ہے، دوسرے محدثین نے بھی اپنی کتابوں کے مختلف ابواب میں اس کی حدیثیں درج کی ہیں، اس طرح یہ صحیفہ ہر زمانہ میں نقل ہوتا رہا، مگر اس کے اصل مجموعے کا پتہ نہ چلتا تھا، چند سال ہوئے دو نسخوں کا پتہ چلا ہے؛ ایک برلن کے کتب خانے میں، دوسرا دمشق میں، اس کی صحت کا ثبوت یہ ہے کہ ان نسخوں اور مسند احمد بن حنبل کی نقل کردہ حدیثوں اور ان کی ترتیب میں بعض ایسے جزوی اختلاف کے علاوہ جو ایک کتاب کے مختلف نسخوں میں عموماً ہوا کرتے ہیں، کوئی بڑا فرق نہیں ہے، یہ صحیفہ حضرت ابوہریرہؓ صحابی کا مرتب کردہ ہے، جن کی وفات ۵۸ھ میں ہوئی ہے، اس اعتبار سے یہ صحیفہ حدیث نبوی کا سب سے قدیم مجموعہ اور تاریخ تدوین حدیث کی بڑی اہم کڑی ہے، اس لیے ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے برلن اور دمشق کے نسخوں کی مدد سے صحیفہ کا ایک صحیح نسخہ مرتب کرکے اس کو عربی مقدمہ کیساتھ

شائع کیا تھا، اب اس کو اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، اور اس پر ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے، جس میں کتابت اور تعلیم کی اشاعت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اہتمام، عہد نبوی اور اس کے بعد عہد صحابہؓ میں احکام و فرامین نبویؐ، آپؐ کے سیاسی معاہدوں اور احادیث نبویؐ کی کتابت اور ان کی تدوین پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ عہد نبوی ہی سے احادیث نبوی کی کتابت شروع ہو گئی تھی، اور عہد صحابہ اور تابعین میں اس کے متعدد مجموعے مرتب ہو گئے تھے، اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ احادیث کی تدوین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی صدی بعد عمل میں آئی، اس لیے یہ صحیفہ بجائے خود حدیث نبوی کے قدیم ترین مجموعے کی حیثیت سے بڑی قابل قدر یادگار ہے،

جہاں آرا بیگم ۔ مرتبہ جناب ضیاء الدین احمد صاحب برنی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۶۰ صفحات، اچھے کاغذ اور عمدہ ٹائپ میں چھپی ہے، قیمت مجلد عہ/۱۰، پتہ تعلیمی مرکز نمبر ۵۰۱ گیدل لیکھراج روڈ متصل ریڈیو پاکستان۔

تیموری شاہزادیوں میں جہاں آرا بنت شاہجہاں اپنی قابلیت، فہم و فراست، متانت و سنجیدگی، اخلاق و سیرت، دینداری اور اعمال خیر کے اعتبار سے بڑی نامور خاتون تھی، تصوف کا اس کو خاص ذوق تھا، اور خواجگان چشت سے بڑی عقیدت رکھتی تھی، ان کے حالات میں مونس الارواح اس کی مشہور تصنیف ہے، یہ چھپ بھی چکی ہے، اور اس کے قلمی نسخے بھی مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، اور وہ خاص نسخہ جو شاہزادی نے بڑے اہتمام سے اپنے لیے لکھوایا تھا، اور جو خطاطی اور آرائش کا بہترین نمونہ ہے، دار المصنفین کے کتب خانے کی زینت ہے، ضیاء الدین صاحب برنی نے آج سے تقریباً ۲۰ سال پہلے جہاں آرا کے حالات میں مذکورہ بالا کتاب لکھی تھی، اب اس کا دوسرا اڈیشن نئے اضافوں کے ساتھ شائع کیا ہے، اس میں شاہزادی کے سوانح، اخلاق و سیرت، علمی قابلیت،

اور مختلف کارناموں اور اعمال حسنہ کے حالات ہیں، کتاب کے آخر میں مونس الارواح کے چند اقتباسات اور اس کے فارسی کے چند خطوط بھی دیدیے ہیں جس سے شاہزادی کے محاسن و کمالات کا اجمالی اندازہ ہو جاتا ہے، مصنف نے جو واقعات لکھے ہیں وہ اگرچہ صحیح ہیں، مگر انھوں نے ان کو تیموری دور کی تاریخوں کے بجائے ثانوی درجہ کے ماخذوں یعنی اردو کی کتابوں اور مضامین سے لیا ہے، جس سے اس کتاب کا علمی وزن ہلکا ہو گیا ہے، مگر اس سے حالات و واقعات کی صحت اور کتاب کے افادہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔

کمار سنبھو ۔ مترجمہ جناب بشیشور پرشاد منور لکھنوی تقطیع بڑی ضخامت ۸۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد صہ، پتہ انجمن ترقی اردو بک ڈپو، اردو بازار، دہلی۔

سنسکرت کے ملک الشعراء کالیداس کی کئی نظموں کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے، انکی ایک مشہور نظم کمار سنبھو بھی ہے، جس کا تعلق ہندو دیومالا سے ہے، جناب منور لکھنوی نے جن کو منظوم ترجمہ کرنے میں خاص مہارت ہے، اور وہ متعدد نظموں کے اردو میں بڑے کامیاب ترجمے کر چکے ہیں، اب کمار سنبھو کو اردو نظم کا جامہ پہنایا ہے، کسی زبان کی نظم کا دوسری زبان کی نظم میں اس طرح ترجمہ کرنا کہ ادبی اور شاعرانہ خوبیاں بھی قائم رہیں، بڑا دشوار کام ہے، مگر لائق مترجم اردو کے کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں اور سنسکرت سے بھی پوری واقفیت رکھتے ہیں، اس لیے انھوں نے ترجمہ میں بڑی حد تک ادبی اور شعری خوبیاں قائم رکھی ہیں مگر یہ ظاہر ہے کہ کسی طویل نظم کے پورے ترجمے میں یکسانیت نہیں ہو سکتی، اور اس میں نشیب و فراز کا ہونا ناگزیر ہے، جو اس ترجمہ میں بھی موجود ہے، مگر اس کا بڑا حصہ اس قدر صاف اور سلیس ہے کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا، اور بعض بندوں پر تو طبعزاد کلام کا دھوکا ہوتا ہے، اس ترجمہ سے اردو ادب میں ایک مفید اضافہ ہوا،

حیوانات قرآنی ۔ مؤلفہ جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی تقطیع چھوٹی ضخامت ۶۸ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲، پتہ: (۱) مکتبہ ندوۃ المعارف بنارس (۲) نمبر ۶۸ لال کوٹھی باغ گونگے نواب، لکھنؤ،

کلام مجید میں وعظ و تذکیر اور احکام و قوانین وغیرہ کے سلسلہ میں مختلف موجودات اور ان کے متعلقات کا ذکر آیا ہے، جس سے ان کے متعلق بہت سے فوائد اور معلومات حاصل ہوتے ہیں، اور قدما نے ان پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، مذکورۂ بالا کتاب بھی اسی قبیل کی ایک مفید تالیف ہے، اس میں ان تمام حیوانات کو جن کا کلام مجید میں ذکر آیا ہے، بہ ترتیب حروفِ تہجی جمع کر دیا گیا ہے، اور ان کے حسب ذیل پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۱) ان کے معنی لکھے گئے ہیں (۲) قرآن مجید میں جہاں جہاں ان کا ذکر آیا ہے، بقید پارہ، سورت اور رکوع پورا حوالہ دیا گیا ہے (۳) قرآن مجید میں ان کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، اس کو بتلایا گیا ہے (۴) ان جانوروں اور ان کے متعلقات کے بارہ میں فنی معلومات جمع کر دیے گئے ہیں (۵) توریت و انجیل میں ان کے متعلق جو کچھ ہے، اس کا بھی اجمالی ذکر کر دیا گیا ہے، (۶) مذاہب شرکیہ میں جو کچھ ہے اس کی جانب بھی اشارہ کر دیا گیا ہے"۔ اس طرح یہ مختصر کتاب حیواناتِ قرآنی کے متعلق مفید معلومات کا ایک گنجینہ ہے۔

ذکر غالب - مؤلفہ جناب مالک رام صاحب ایم اے تقطیع اوسط ضخامت ۲۸۸ صفحات کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ۶ر پتہ مکتبہ جامعہ اردو بازار دہلی نمبر ۶

یہ کتاب مصنف کی پرانی اور مشہور و مقبول تالیف ہے، یہ اس کا تیسرا اڈیشن ہے، ہر اڈیشن میں کچھ نہ کچھ اضافے ہوتے رہے، یہ نیا اڈیشن سب سے زیادہ جامع اور مکمل ہے، غالب کے حالات اور سوانح پر اردو میں اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے، اس کتاب میں بڑے سلیقہ سے اس کی تلخیص کر دی گئی ہے، اس طرح یہ کتاب غالبیات کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، اور اس کا مطالعہ بہت سی طویل کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتا ہے، مصنف نے اپنی تحقیق سے بعض نئے اضافے بھی کر دیے ہیں۔

"م"

مکتبہ دارالمصنفین

سلسلۂ تاریخ اسلام

تاریخِ اسلام (حصۂ اول) عہدِ رسالت و خلافتِ راشدہ یعنی آغازِ اسلام سے لیکر خلافتِ راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی، سیاسی، تمدنی، اور علمی تاریخ، قیمت ۴ر

تاریخِ اسلام (حصۂ دوم) (بنی امیہ) یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل قیمت ۴ر

تاریخِ اسلام (جلد سوم) (خلافتِ عباسیہ) یعنی ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ/۷۵۰ء سے ابو اسحاق متقی اللہ ۳۳۳ھ/۹۴۴ء تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ؛ قیمت ۵ر

تاریخِ اسلام (جلد چہارم) (خلافتِ عباسیہ دوم) اس میں مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافتِ عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی تاریخ ہے، اور آخر میں ایک مستقل باب میں عباسیون کے تمدنی کارناموں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس طرح سے یہ جلد پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ ضخیم اور مکمل ہو گئی ہے،

(از شاہ معین الدین احمد ندوی)

قیمت: ۶ر

نئی کتابیں

تاریخِ سندھ سندھ کی مفصل سیاسی، نظامی، علمی، و تمدنی تاریخ:- قیمت: ۶ر (چھ روپیہ)

اقبالِ کامل ڈاکٹر اقبال کے سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل، ۶ر

بزمِ تیموریہ تیموری بادشاہوں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے امراء و شعراء اور فضلاء کے تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل، قیمت ۵ر

امام رازی امام فخر الدین رازی کے سوانح و حالات ان کی تصنیفات کی تفصیل اور فلسفہ و علم کلام و تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق ان کے نظریات و خیالات کی تشریح قیمت ۳ر

بزمِ صوفیہ عہدِ تیموریہ سے پہلے کے صاحبِ تصنیفات صوفیہ کرام مثلاً شیخ ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ نظام الدین اولیاء وغیرہ کے مستند حالات اور تعلیمات، قیمت ۶ر

تاریخِ اندلس (جلد اول) اندلس کے عہد بعہد کی مفصل سیاسی تاریخ کے ساتھ اندلس کی تمدنی تاریخ، قیمت ۸ر

اہلِ کتاب آنحضرت کے ان تابعین یہودی و نصرانی اہل کتاب صحابہ و تابعین کا تذکرہ ...